اثباتِ آخرت کے لیے قرآن کا استدلال

سورۃُ القیامۃ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ..... امَّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس اِن صفحات میں جاری ہے اس کا درسِ نہم سورۃ القیامۃ پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ دو رکوعوں اور چالیس آیات پر مشتمل ہے اور قرآن حکیم کے انتیسویں (۲۹) پارے کے آخری رُبع میں شامل ہے۔ مصحف کی ترتیب کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کا نمبر ۷۶ ہے۔

سورۃ التغابن پر ان دروس کی تکمیل ہو چکی ہے جن میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے، لیکن چونکہ ہمارے دین کے اعتقادی نظام میں، یا یوں کہہ لیجیے کہ اسلام کی فکری و نظریاتی اساسات میں قیامت پر ایمان اور آخرت پر یقین کو بہت اہمیت حاصل ہے، لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ ایک درسِ خاص اسی موضوع پر اس منتخب نصاب میں شامل کیا جائے، اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قیامت اور آخرت کے موضوع پر قرآن حکیم کی نسبتاً چھوٹی سورتوں میں جامع ترین سورت سورۃ القیامۃ ہے۔

آخرت پر ایمان کی خصوصی اہمیت

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مضامین اور مطالب پر غور کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بالآخرۃ کی اہمیت کے بارے میں چند تمہیدی باتیں نوٹ کر لی جائیں۔

قیامت اور آخرت پر ایمان کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کے ہر پڑھنے والے کو

بآسانی ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ قرآن حکیم کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں آخرت کا ذکر خفی یا جلی انداز میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ مصحف کے ہر صفحے پر کسی نہ کسی اسلوب سے بعث بعد الموت' حشر ونشر' حساب کتاب' جزا وسزا اور جنت و دوزخ میں سے کسی نہ کسی کا ذکر لازماً موجود ہے۔

جن مقامات کا مطالعہ ہم اس سلسلۂ درس میں کر چکے ہیں اگر ہم ان کا سرسری جائزہ لیں تو بادنیٰ تأمل نظر آ جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک میں آخرت کا ذکر موجود ہے۔ ہمارا پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر ''ایمان'' کا ذکر آیا' لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔ البتہ دوسرے ہی درس میں' جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ پر مشتمل ہے اور جسے ہم نے ''آیۂ بر'' سے موسوم کیا تھا' ایمانیات کی تفصیل کے ضمن میں ایمان باللہ کے فوراً بعد یوم الآخر پر ایمان کا ذکر ہے: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''بلکہ حقیقی نیکی تو اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر''۔

ہمارا تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک تو قانونِ مجازات ومکافاتِ عمل کا ذکر ہے جو بڑے جامع الفاظ میں حضرت لقمان کی وصیت میں آیا ہے:

﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝۱۶﴾

''اے میرے پیارے بچے! (اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ) انسان کے عمل کو (نیکی ہو یا بدی) خواہ وہ رائی کے دانے کے ہم وزن ہو' پھر خواہ وہ کسی غار یا چٹان کے اندر (چھپ کر) کیا جائے' خواہ وہ آسمانوں (فضاؤں اور خلاؤں) میں جا کر یا زمین (کی گہرائیوں) میں اُتر کر کیا جائے' اللہ اس کو (جزا وسزا کے دن) لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین ہے' باخبر ہے۔''

اس کے علاوہ اس رکوع میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے: ﴿اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝۱۴﴾ ''میری ہی طرف لوٹنا ہے۔''

اگلی آیت کے آخر میں الفاظ آئے:

﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴿۱۵﴾﴾

''پھر میری ہی طرف تم سب کو آنا ہے' پھر میں تم سب کو جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

ہمارا چوتھا سبق سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل تھا' جس میں اہلِ ایمان کے لیے ان کی استقامت کا انعام جنت کی شکل میں دینے کا وعدہ فرمایا گیا اور اس ضمن میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ﴿۳۱﴾﴾

''اور اس میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے وہ سب کچھ بھی ہوگا جسے تم طلب کرو گے۔''

پانچواں درس اساس القرآن سورۃ الفاتحہ پر مشتمل تھا' اس میں ایک عظیم آیت مبارکہ اسی حقیقتِ کبریٰ کے اظہار کے لیے وارد ہوئی' یعنی: ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ﴿۴﴾﴾ ''جزا و سزا کے دن کا مالک۔''

چھٹا سبق سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل تھا' اس میں آپ نے دیکھا کہ کس شد و مد کے ساتھ آخرت کا ذکر آیا:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ﴿۱۹۲﴾﴾

''اے ہمارے ربّ! تو نے یہ (سلسلۂ کون و مکاں) فضول اور بے کار پیدا نہیں کیا ہے' تو پاک ہے (منزہ ہے اس سے کہ کوئی بے مقصد اور عبث کام کرے)' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ اے ہمارے آقا! یقیناً جس کو تو نے دوزخ میں ڈال دیا اُسے تو بالکل ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

ذرا آگے چل کر الفاظ آئے: ﴿وَلَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ﴾ (آیت ۱۹۴) ''اور (اے ہمارے ربّ!) ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجیو''۔ پھر مزید آگے چل کر اللہ تعالیٰ

نے اپنے فرماں بردار بندوں کو اِن الفاظ میں اطمینان دلایا:

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾

(آیت ۱۹۵)

''میں لازماً ان کی برائیاں ان سے دور کر دوں گا اور ان کو لازماً اُن باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں''۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قیامت کے وقوع اور اُخروی جزا و سزا کے یقینی ہونے پر کتنا زور ہے۔

اس کے بعد درس ہفتم یعنی سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں قیامت کے دن کی ہولناکی کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آیا:

﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝۳۷﴾

''(اللہ کے نیک اور محبوب بندے) لرزاں و ترساں رہتے ہیں اُس دن کے خیال سے جس دن دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گے۔''

درس ہشتم یعنی سورۃ التغابن میں تو بلاشک و شبہ یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا' چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳﴾ ''اور اُسی (اللہ) کی طرف لوٹ جانا ہے''۔ پھر ساتویں آیت میں پہلے تو منکرین قیامت کا یہ اعتراض یا مغالطہ نقل کیا گیا:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ﴾

''ان منکرین کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہیں اٹھایا نہ جائے گا۔''

پھر نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا:

﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ﴾

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے کہ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے اور پھر تمہیں لازماً جتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

اور ذرا آگے چل کر فرمایا:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ (آیت ۹)

''(جان لو کہ) وہ دن، جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن، وہ ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن!''

یعنی اُس روز جو کامیاب قرار دیا گیا وہی اصلاً کامیاب و کامران ہوا۔ پھر اس کامیابی کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی:

﴿..... يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

''.....اللہ اس سے اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی، یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی دراصل بڑی کامیابی ہے۔''

اس کے برعکس جو ناکام قرار پائے گا اور نامراد رہے گا اس کے انجامِ بد کا بیان اگلی آیت میں وارد ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے کفر و انکار کا راستہ اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلاتے رہے وہی لوگ دوزخ والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

اس سرسری سے جائزہ سے اندازہ ہو گیا کہ اب تک ہم نے قرآن حکیم کے جن معدودے چند مقامات کا مطالعہ کیا ہے ان میں بھی کس قدر شد و مد کے ساتھ بعث بعد الموت، قیامِ قیامت اور آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا ذکر آ چکا ہے۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی نوٹ کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اہم تقابل سامنے آتا ہے کہ جہاں دوسرے ایمانیات کے لیے لفظ ایمان آیا ہے، وہاں آخرت کے لیے عموماً لفظ یقین استعمال ہوا ہے، جیسے سورۃ البقرۃ کے آغاز میں وحیٔ الٰہی اور کتب سماویہ پر ایمان کا ذکر تو ان الفاظ میں آیا کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ (آیت ۴)

''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبیؐ!) آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔''

لیکن آخرت پر ایمان کا ذکر ہوا اِن الفاظ کے ذریعے کہ:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾

''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالآخرت میں وہ گہرائی اور شدت مطلوب ہے جسے ہم ''یقین'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اصولی' نظری اور علمی اعتبار سے ایمان اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''ایمانِ مجمل'' میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسے کہ وہ اپنے اَسماء اور صفات سے ظاہر ہے' اور میں نے قبول کیے اس کے جملہ احکام' میں اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے۔''

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت دونوں ایمان باللہ کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا تکمیلی ظہور ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اگر عملی اور اخلاقی اعتبار سے غور کیا جائے تو سب سے مؤثر ایمان' ایمان بالآخرت ہے۔ اس لیے کہ اگر آخرت کا یقین ہوگا' مرنے کے بعد محاسبہ کے لیے جی اٹھنے کا یقین ہوگا' جزا و سزا کا یقین ہوگا' جنت و دوزخ کا یقین ہوگا تو انسان کے رویے میں عملی تبدیلی لازماً آئے گی' اور اگر ایمان بالآخرت میں کمی رہ گئی تو ایمان باللہ بھی ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کی ایک علمی بحث بن کر رہ جائے گا اور ایمان بالرسالت بھی عشقِ رسول ﷺ کے محض زبانی دعووں کی صورت اختیار کر لے گا اور رسول اللہ ﷺ

کی اطاعت اور اتباع کی نوبت نہیں آئے گی۔

اس مقام پر ضمناً یہ بھی جان لیجیے کہ قانونی، فقہی اور شرعی اعتبار سے اہم ترین ایمان، ایمان بالرسالت ہے۔ چنانچہ ایمان باللہ اسی وقت معتبر ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کو اُن اَسماء و صفات کے ساتھ مانا جائے جن کی خبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے، اور ایمان بالآخرت بھی تب ہی معتبر ہوگا جب بعث بعد الموت، حشر ونشر، حساب کتاب، وزنِ اعمال، جزا وسزا اور جنت و دوزخ کی ان تفاصیل کو مانا جائے جن کی خبر حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہمارے یہاں خود کو مسلمان کہلانے والا عقلیت زدہ لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ آخرت حقیقی اور واقعی نہیں ہے بلکہ محض ایک نظریہ اور تصور ہے، جس سے اصل مقصود دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہے، چنانچہ جنت و دوزخ اور جزا وسزا کا جو تصور قرآن مجید دیتا ہے اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی معاشرتی، سماجی، سیاسی، معاشی الغرض پوری اجتماعی زندگی عدل وقسط پر قائم ہو جائے اور انسان دنیا میں امن وسکون کے ساتھ بہتر سے بہتر طریق پر زندگی بسر کر سکے۔ یہ خیال اپنی اصل کے اعتبار سے خالص گمراہی اور زندقہ ہے۔ آخرت ہرگز صرف تصور اور محض نظریہ نہیں ہے، بلکہ ایک واقعہ ہے جو لازماً ظہور پذیر ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے اس بات پر زور دیا گیا ہے، جیسے سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾ ''جس (قیامت و آخرت) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل برحق ہے، اور جزا وسزا لازماً واقع ہو کر رہے گی''۔ یا جیسے سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ ''جس چیز کی دھمکی تمھیں دی جا رہی ہے وہ لازماً واقع ہو کر رہے گی''۔ (یعنی نری دھمکی اور خالی دھونس نہیں ہے!)

جو لوگ آخرت کو محض ایک تصور اور نظریہ قرار دے کر یہ امید بھی کرتے ہیں کہ اس

سے اس دُنیا میں عدل وقسط پر مبنی ایک اجتماعی نظام وجود میں آ سکتا ہے' وہ ایک شدید مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ محض تصور ونظریہ سے یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ انسان کی سیرت' اس کے کردار' اخلاق اور اعمال و معاملات پر واقعی اور عملی اثر محض آخرت کے تصور یا نظریہ کا نہیں بلکہ صرف یقین کے درجے تک پہنچے ہوئے ایمان ہی کا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک معاشرے میں آخرت پر قلبی یقین رکھنے والے لوگ معتد بہ تعداد میں موجود ہوں گے تو اس کی برکت سے اور اس کے نتیجے میں اس دنیا میں مبنی بر عدل وقسط اجتماعی نظام بھی لازماً وجود میں آئے گا' لیکن ایمان بالآخرت کا اصل مقصود صرف ہماری دُنیوی بہبود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مطلوب محاسبۂ اُخروی میں سرخرو اور کامیاب وکامران ہونا ہے' اور یہ نصب العین ہماری دُنیوی فلاح و بہبود اور امن وسلامتی سے اس طرح مربوط ومتعلق ہے کہ آخرت کی وہ تفاصیل جو قرآن اور حدیثِ رسولؐ میں بیان ہوئی ہیں اُن پر قلبی یقین اور اس کے مطابق اس دنیا میں اپنے رویے اور عمل کی اصلاح وتعمیر کے بغیر نہ دنیا میں نظامِ عدل وقسط قائم ہوسکتا ہے اور نہ اُخروی نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ الغرض یومِ قیامت ایک اٹل اور شدنی امر ہے اور آخرت ایک حقیقتِ کبریٰ ہے' اور اس کا حتمی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ہمیں پیشگی عطا فرما دیا ہے' تاکہ ہمارے تمام اعمال کا اصل محرک اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اُخروی نجات بن جائے' جس کے لیے قرآن حکیم دوٹوک انداز میں ہمیں آگاہ اور متنبہ کرتا ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾ (النّٰزعٰت)

''پس جب قیامت کا ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا' جو کچھ انسان نے دنیا میں کیا ہے اس دن وہ اس کو یاد کرے گا' اور دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے بے نقاب کر دی

جائے گی‘ تو جس نے (دنیا میں) سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر مقدم رکھا تھا‘ تو یقیناً اس کا ٹھکانہ تو بس دوزخ ہی ہے‘ اور جو اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے سے (یعنی محاسبہ کے لیے پیشی سے) ڈرا تھا۔ اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا رہا تھا تو لاریب اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔‘‘

انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

یہ بات بھی جان لیجیے کہ انکارِ قیامت اور انکارِ آخرت کی متعدد شکلیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ منکرین کا ایک استبعاد اور استعجاب تو وہ ہے جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ اس کی صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ قٓ میں فرمایا:

﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳﴾

’’(یہ کافر کہتے ہیں) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟) یہ لوٹنا بہت دور کی بات ہے۔‘‘

سورۂ یٰسٓ میں‘ جسے نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کا قلب قرار دیا ہے‘ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۷ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸﴾

’’کیا انسان نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا‘ بایں ہمہ وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا۔ اور لگا ہماری نسبت باتیں بنانے اور اپنی تخلیق (اصل حقیقت) کو بھول گیا‘ کہتا ہے کہ کون (آدمی کی) ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں؟‘‘

یہیں پر اگلی آیت میں فرمایا:

﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝۷۹﴾

’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ جس نے ان کو اوّل بار پیدا کیا تھا وہی اِن کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ اور سب خلق اس کے علم میں ہے۔‘‘

یہ تو منکرین کا استعجابی انداز سے انکار کا ذکر ہوا۔ ایک صاف اور صریح انکار بھی

ہے کہ مرنے کے بعد کوئی جی اُٹھنا نہیں ہے‘ کوئی آخرت نہیں ہے‘ زندگی بس اس دنیا ہی کی زندگی ہے۔ اس کو الحاد اور دہریت کہا جاتا ہے۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ صرف عہدِ حاضر کی ضلالت ہے‘ اس خیال کے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا‘ چنانچہ اُن کا قول سورۃ الجاثیہ میں نقل ہوا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ (آیت ۲۴)

’’اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی زندگی سوائے ہماری اس دنیا کی زندگی کے‘ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے سوائے گردشِ زمانہ کے۔‘‘

اس قول میں انکارِ آخرت ہی نہیں‘ اللہ کا انکار بھی بین السطور موجود ہے۔ یہ خالص الحاد و دہریت ہے جس کا پورا خلاصہ قرآن حکیم کی اس ایک آیت میں نقل کر دیا گیا ہے۔

انکار کی ایک تیسری شکل یہ ہے کہ نہ انکار ہو نہ اقرار‘ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا عملی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو صریح انکار کا ہے! قرآن مجید میں یہ شکل بھی کچھ لوگوں کے اس قول کی صورت میں بیان ہوئی ہے :

﴿..... اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲﴾ (الجاثیۃ)

’’(آخرت کا) کچھ گمان سا تو ہوتا ہے (کہ شاید واقع ہو)‘ لیکن اس پر ہمارا دل نہیں ٹھکتا (یقین حاصل نہیں ہوتا)۔‘‘

ظاہر بات ہے کہ جب یہ شکل ہوگی تو انسان کا رویہ اور اس کا طرزِ عمل ان ہی لوگوں سے مشابہ اور مطابق ہوگا جو آخرت کو نہیں مانتے‘ اگرچہ منطقی طور پر یہ نہ صریح انکار ہے نہ واضح اقرار!

سب سے زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ بظاہر پورے طور پر اقرار موجود ہو لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں مانی گئی ہوں جن کے نتیجے میں یہ اقرار اور یہ ایمان بالآخرت بالکل غیر مؤثر ہو جائے اور اس کا انسان کے عمل اور اس کے اخلاقی رویّے پر کوئی صحت منداور صالح اثر مترتب نہ ہو۔ اس کی بھی تین شکلیں قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے شفاعتِ باطلہ کا تصور ہے کہ آخرت ہوگی تو سہی‘ لیکن ہماری کچھ دیویاں اور دیوتا ہیں‘ یا کچھ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں جو ہمیں وہاں سے چھڑا لیں گے۔ ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (یونس: ۱۸) ’’یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں‘‘۔ ظاہر ہے کہ اس شکل میں بھی آخرت کا ماننا نہ ماننا برابر ہوگیا۔ واضح رہے کہ یہاں شفاعتِ باطلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے‘ نہ کہ اُس شفاعتِ حقہ کا جس کا ثبوت قرآن اور حدیث دونوں سے ملتا ہے اور جو تین شرائط سے مشروط ہے ـــــ یعنی اوّلاً یہ کہ یہ اُسی کی جانب سے ہوگی جسے بارگاہِ خداوندی سے اِذن مل جائے‘ پھر اُسی کے حق میں ہوگی جس کے لیے اجازت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مبنی برحق و انصاف ہوگی‘ نہ کہ عدل و قسط کے تقاضوں کو پامال کرنے والی۔

قرآن حکیم میں آخرت کے اس انکار مع الاقرار کی دوسری شکل یہ بیان ہوئی ہے کہ کچھ مرفہ الحال اور دولت مند لوگ اپنی دولت مندی اور آسودہ حالی کو اپنے اس زعم کی دلیل بنا لیتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں‘ اور ہم پر اس دنیا میں بھی اللہ کا فضل ہو رہا ہے‘ چنانچہ اس نے ہمیں یہاں دولت دی ہے‘ شرف و عزت سے نوازا ہے‘ لہٰذا اگر آخرت واقع ہو ہی گئی تو وہاں بھی ہم شرف و عزت پائیں گے‘ قطع نظر اس سے کہ ہمارے اعمال کیا ہیں! سورۃ الکہف میں دو افراد کے مکالمہ کے ضمن میں ایک ایسے ہی برخود غلط شخص کا قول نقل ہوا ہے کہ:

﴿وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۶﴾

’’(اوّل تو) مجھے یقین ہی نہیں ہے کہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے‘ اور اگر (بالفرض) مجھے اپنے پروردگار کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تو میں لازماً وہاں پہنچ کر بھی اس سے بہتر پاؤں گا۔‘‘

یہی بات سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمائی گئی ہے۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾

''اور (انسان کا حال یہ ہے کہ) اگر ہم اسے اپنی رحمت سے (آسودگی سے) نوازتے ہیں کچھ تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہے ہی' اور (رہی قیامت' تو اوّل تو) مجھے یہ گمان (اور اندیشہ) ہے ہی نہیں کہ قیامت واقع ہونے والی ہے' تاہم اگر میں اپنے ربّ کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تو بھی میرے لیے اُس کے ہاں اچھائی ہی اچھائی ہوگی۔ پس ہم لازماً جتلا دیں گے منکروں کو جو انہوں نے کیا ہے اور ہم انہیں لازماً چکھائیں گے ایک گاڑھا عذاب۔''

اس انکار مع الاقرار کی تیسری و آخری شکل جو سب سے زیادہ لطیف لیکن اتنی ہی زیادہ خطرناک بھی ہے' یہ ہے کہ شیطان انسان کو اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری کے حوالے سے دھوکہ دیتا ہے کہ وہ بڑا بخشن ہار ہے' بڑا نکتہ نواز ہے' لہٰذا وہ تمہیں معاف کر ہی دے گا۔ سورۃ الحدید میں تفصیلاً ذکر ہے کہ آخرت میں منافقین پکار پکار کر اہلِ ایمان سے کہیں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ بحیثیت مسلمان شامل نہ تھے' پھر یہاں ہمیں تم سے کیوں جدا کر دیا گیا؟ تو اہل ایمان سے جواب دلوایا جائے گا کہ تم بظاہر تو مسلمان تھے لیکن اعمال کے اعتبار سے اور ایمان' بالخصوص ایمان بالآخرت کے لحاظ سے تم نے اپنے آپ کو ریب وتشکک اور تربص وتردّد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں:

﴿وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (الحدید)

''اور تم کو تمہاری تمناؤں (پر مبنی من گھڑت خیالات) نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ پہنچا (یعنی مہلتِ عمر تمام ہوئی) اور تمہیں خوب دھوکہ دیا اللہ پر (یعنی اس کی شانِ رحیمی وغفاری کے حوالے سے) اس بڑے دھوکہ باز (یعنی شیطان لعین) نے!''

مزید برآں آخری پارے کی ایک عظیم سورۃ یعنی سورۃ الانفطار کا تو مرکزی مضمون ہی یہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ ''اے انسان! تجھے کس چیز نے

اپنے ربِّ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے؟'' اس لیے کہ جہاں وہ کریم ہے' رحیم ہے' غفور ہے وہاں وہ عادل و منصف بھی ہے اور ''قَائِمٌ بِالْقِسْطِ'' بھی' اور ''شَدِیْدُ الْعِقَابِ'' بھی ہے اور ''سَرِیْعُ الْحِسَابِ'' بھی! حتیٰ کہ ''عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ'' بھی ہے' یعنی زبردست اور شدید انتقام لینے والا۔ (اے اللہ! ہم تیری اس شانِ انتقام سے تیری ہی رحمت کے دامن میں پناہ کے طالب ہیں!)

پس انکارِ آخرت کی یہ مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں ان کا اختصار کے ساتھ تجزیہ اس لیے کر دیا گیا ہے کہ ہم بھی اپنے ذہنوں کا بھرپور جائزہ لیں اور اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ مبادا ہمارے قلوب و اَذہان اور فکر و نظر میں بھی اس قسم کے بے بنیاد وسوسوں اور موہوم خیالات کا عکس موجود ہو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بظاہر ہم مطمئن ہوں کہ ہم آخرت کے ماننے والے ہیں لیکن غیر محسوس طور پر ہمارے تحت الشعور میں اس قسم کے مغالطے موجود ہوں جن کا اس درس میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تمام باتیں جو اَب تک پیش کی گئی ہیں' تمہیدی نوعیت کی ہیں۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اہم بات بھی اس موقع پر اجمالاً عرض کر دی جائے' اور وہ یہ کہ قیامت سے مراد کیا ہے؟ اس دنیا کا خاتمہ یا پوری کائنات کا خاتمہ؟ اس ضمن میں قرآن حکیم میں تین مراحل کا ذکر آتا ہے۔ ایک اس دنیا اور اس کے نوامیس و قوانین کے خاتمے کا مرحلہ ہے۔ دوسرا بعث بعد الموت کا مرحلہ ہے جس سے حیاتِ اُخروی کا آغاز ہوگا اور جزا و سزا کے فیصلے نافذ ہوں گے۔ تیسرا اس پوری کائنات کے آخری انجام کا مرحلہ ہے۔ تدبر قرآن کے ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن حکیم زیادہ تر گفتگو پہلے دو مرحلوں کے بارے میں کرتا ہے۔ تیسرے مرحلے کے بارے میں کوئی تفصیلی وضاحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے' چنانچہ اس کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے! پہلے مرحلے کو قرآن مجید بہت سے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال لفظ ''اَلسَّاعَۃُ'' ہے' یعنی وہ متعین گھڑی جب ایک بڑی ہل چل مچے گی' ایک بہت بڑی تباہی آئے گی' دنیا کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا' اجرامِ فلکیہ

ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی مانند ہو جائیں گے۔ یہ نقشہ ہے ''اَلسَّاعَۃُ'' کا۔ اسی کو اَلْقَارِعَۃُ' اَلْحَآقَّۃُ' اَلطَّآمَّۃُ الْکُبْرٰی اور اَلصَّآخَّۃُ وغیرہ جیسے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے بعث بعد الموت کا' جس کے بعد تمام اوّلین و آخرین اور کل جن و اِنس عدالتِ اُخروی میں حساب کتاب کے لیے پیش ہوں گے۔ قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کا وہ دن نہایت طویل بھی ہوگا اور حد درجہ ہولناک بھی' جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا ﴿۱۷﴾﴾ ''وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا''۔ اور ہمارے ایک سابقہ درس (سورۃ النور) میں یہ الفاظ آ چکے ہیں: ﴿یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾﴾ ''وہ دن' جب دل اور نگاہیں سب کے سب اُلٹ جائیں گے!'' اس کے لیے بھی قرآن مجید میں متعدد الفاظ آتے ہیں' چنانچہ اسے ''یَوْمُ الدِّیْنِ'' بھی کہا گیا ہے اور ''یَوْمُ الْفَصْلِ'' بھی' پھر اسی کو ''یَوْمُ التَّغَابُنِ'' بھی قرار دیا گیا ہے اور ''یَوْمُ الْحِسَابِ'' بھی' لیکن اس کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال نام ''یَوْمُ الْقِیَامَۃِ'' ہے' یعنی کھڑے ہونے کا دن' جس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر سورۃ المُطَفّفین میں ان الفاظ سے کی گئی ہے:

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶﴾﴾

''وہ دن جس میں تمام انسان پروردگارِ عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے!''

قرآن کا عمومی اسلوب' مکی اور مدنی سورتوں کا فرق

سورۃ القیامۃ کے بارے میں چند تعارفی اور تمہیدی باتوں کے بعد اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم پر غور کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے مناسب ہے کہ پہلے ایک نظر اس پوری سورت کے سلیس اور رواں ترجمہ پر ڈال لیں' جو حسبِ ذیل ہے:

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! مجھے قسم ہے نفسِ ملامت گر کی۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو (ٹھیک جوڑ دیں اور) برابر کر دیں۔ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) انسان اپنے آگے بھی فسق و فجور کو جاری رکھنا

چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن؟— تو جب نگاہ چندھیا جائے گی' اور چاند بےنور ہو جائے گا' اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے' تو اس دن کہے گا یہی انسان کہ کہاں ہے بھاگ جانے کی جگہ؟— کوئی نہیں! کوئی ٹھکانا نہیں! اس روز تو تیرے ربّ ہی کے حضور میں جا ٹھہرنا ہے۔ اس روز جتلا دیا جائے گا ہر انسان کو ہر اُس چیز کے بارے میں جو اُس نے آگے بھیجی اور جو پیچھے چھوڑی۔ بلکہ انسان خود اپنے بارے میں (پورے طور سے) آگاہ ہے' خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے۔ (اے نبیﷺ!) آپ اس (قرآن) کے ساتھ تیزی سے اپنی زبان کو حرکت مت دیجیے کہ اسے جلدی سے حاصل کر لیں۔ تحقیق ہمارے ذمے ہے اس کو جمع کرنا بھی اور اس کو پڑھوانا بھی۔ پس جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجیے۔ پھر بلاشبہ ہمارے ہی ذمے ہے اس کی مزید تشریح اور توضیح بھی۔ کوئی نہیں! بلکہ (تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ) تم لوگ دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو! بہت سے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوئے— اور بہت سے چہرے اُس دن سوکھے اور اداس ہوں گے اور یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے— کوئی نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آ پھنسے گی' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور انسان یہ سمجھ لے گا کہ اب (دنیا سے) جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ اُس روز تیرے ربّ ہی کی طرف ہانکے جانا ہے۔ پس نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی' بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ موڑ لی۔ پھر چل دیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا۔ افسوس ہے تجھ پر' پس افسوس ہے۔ پھر افسوس ہے تجھ پر' پس پھر افسوس ہے— کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی بے قید چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا نہیں تھا وہ منی کی ایک بوند جو ٹپکائی گئی؟— پھر وہ تھا ایک لوتھڑا جسے اللہ نے بنایا اور سنوارا۔ پھر اسی میں سے بنا دیے جوڑے' نر اور مادہ — کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر سکے؟'' (یقیناً اے ہمارے ربّ! تو اس پر قادر ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں!)

اس سورۂ مبارکہ کا جو مجموعی تأثر اور اس کے مضامین کا جو اجمالی نقشہ ہمارے

سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں قیامِ قیامت اور جزا وسزا کے لیے مثبت استدلال کو تو صرف دو قسموں کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے' البتہ منفی طور پر منکرینِ قیامت کے موقف کا ابطال قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان کے اعتراضات اور دلائل کی قلعی کھول دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک طرف اُن کے استعجاب اور استبعاد کو دور کرنے کے لیے اللہ کی اس قدرتِ کاملہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس کا سب سے بڑا مظہر خود انسان کی اپنی پیدائش ہے' اور دوسری طرف منکرینِ قیامت کی گمراہی کا اصل سبب بھی بیان کر دیا گیا اور ان کے مرض کی اصل تشخیص بھی کر دی گئی' یعنی حب عاجلہ (دنیا کی محبت) میں گرفتار اور فسق و فجور اور ظلم و تعدی کا خوگر ہو جانا' جس کی بنا پر انسان حساب کتاب اور جزا وسزا کے تصور تک سے بھاگتا ہے اور اس کبوتر کی مانند جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے' نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ قیامت' حشر ونشر' حساب کتاب اور جزا وسزا کے تصور سے اپنے موجودہ عیش کو مکدر کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان چاہے زبان سے کچھ کہے' اس کے انکارِ قیامت کا اصل سبب وہی ہے جو اِس سورۂ مبارکہ میں ﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵﴾ ''بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) انسان اپنے آگے بھی فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے'' اور ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰﴾ ''کوئی نہیں! بلکہ تم لوگ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو'' کے الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا۔ ضمنی طور پر ایک نہایت لطیف پیرائے میں یہ حقیقت بھی کھول دی گئی کہ دعوتِ دین اور ابلاغ وتبلیغ حتیٰ کہ تحصیلِ علم کے معاملے میں بھی ''عجلت پسندی'' مناسب نہیں ہے۔

یہ تو اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا اجمالی تجزیہ ہوا۔ اب مناسب ہے کہ اس کے سلسلہ وار مطالعہ سے قبل قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور اس کی مکی اور مدنی سورتوں کے مزاج کے فرق کے ضمن میں بعض باتیں بطورِ تمہید عرض کر دی جائیں' جو اِن شاء اللہ فہمِ قرآن بالخصوص تدبرِ قرآن کے ضمن میں کلید کا کام دیں گی۔

قرآن مجید کے عمومی اسلوب کے بارے میں یہ بات جان لینی از حد ضروری ہے کہ قرآن حکیم عام دُنیوی تصنیفات کی مانند نہیں ہے۔ ہماری تصانیف اور تالیفات کا اپنا

مخصوص انداز ہوتا ہے' ایک خاص ترتیب ہوتی ہے اور ایک معین نہج ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں ابواب ہوتے ہیں اور ہر باب میں مضمون کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے' پھر اُس کو اگلے باب میں دہرایا نہیں جاتا۔ جو لوگ قرآن حکیم کو دنیا کی عام تصنیفات و تالیفات پر قیاس کر کے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں دِقت کا سامنا بھی ہوتا ہے اور ناکامی بھی ہوتی ہے۔ اچھی طرح جان لیجیے کہ نہ قرآن مجید عام تصانیف و تالیفات کی مانند ہے' نہ اس کی سورتوں کی حیثیت کتاب کے ابواب کی ہے' نہ یہ مجموعۂ مضامین یا مجموعۂ مقالات کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کا اسلوب خطبہ کا ہے اور قرآن مجید کی سورتیں گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مصحف میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کو ہم ''مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب خطبہ کے اسلوب میں چند امور اس کے لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ ان امور کو سمجھ لیا جائے تو قرآن حکیم کے فہم میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

پہلی بات یہ کہ جب کوئی شعلہ بیان خطیب کوئی خطبہ دے رہا ہو تو اس میں بار بار خطاب کا رُخ بدلتا ہے' چنانچہ ابھی خطیب دائیں طرف مخاطب تھا اور گفتگو کر رہا تھا' پھر وہ بائیں جانب کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا' اب وہ ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اسی طرح اگرچہ اس کے مخاطب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ان سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے' لیکن کبھی یہ گفتگو صیغۂ حاضر و خطاب میں نہیں بلکہ صیغۂ غائب میں ہونے لگتی ہے' اور اس میں فصاحت و بلاغت کا ایک خاص رنگ اور تاثیر کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ موجود نہیں ہوتے' ان کو وہ موجود اور حاضر فرض کر کے ان سے صیغۂ خطاب و حاضر میں گفتگو شروع کر دیتا ہے اور دورانِ خطبہ یہ ''تحویل خطاب'' بار بار اور وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا ہے۔ مزید برآں خطبات میں عام طور پر مخاطبین کے اعتراضات کو نقل کیے بغیر اور ان کے سوالات کو بیان کیے بغیر اُن کے جوابات دے دیے جاتے ہیں' اور ان جوابات کا اسلوب و انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطبین خواہ وہاں موجود ہوں خواہ نہ ہوں اور ان تک وہ باتیں بعد میں روایتاً

پہنچیں، خود جان لیتے ہیں کہ یہ باتیں فلاں اعتراض کے جواب میں کہی جارہی ہیں اور یہ تشریحات فلاں مسئلہ کی وضاحت میں پیش کی جارہی ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا، خطبہ کے اس اسلوب و انداز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو فہمِ قرآن میں بڑی مدد ملے گی۔ اور اگرچہ پورے قرآن کا اسلوب یہی ہے، تاہم بعض سورتوں میں یہ بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ خطبہ کا یہ انداز اس سورۂ مبارکہ میں نہایت شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہاں ساری گفتگو منکرین قیامت سے ہو رہی ہے، کبھی صیغۂ حاضر میں ان سے براہِ راست خطاب ہے، کبھی ''الانسان'' کے حوالے سے بصیغہ غائب گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیان میں چند باتیں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرما دی گئیں اور اس طرح تحویل خطاب کی نمایاں مثال سامنے آ گئی۔ پھر خطاب کا رُخ دوبارہ منکرین قیامت و آخرت اور مخالفین بعث بعد الموت کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا خطابت کے اسلوب و انداز کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اسلوبِ قرآنی کی نہایت اہم اور نمایاں مثال ہے۔

دوسری بات یہ کہ جیسے ایک اعلیٰ پائے کے خطیب کے ہر خطبے کا ایک مرکزی موضوع یا مرکزی خیال یا ایک عمود ہوتا ہے اور خطیب کی تمام گفتگو اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے، اور اگرچہ وہ تمہید کے طور پر یا مختلف دلائل و شواہد کے ضمن میں ایسے مباحث پر بھی اظہارِ خیال کرتا ہے جن کا بظاہر اس کے خطبہ کے عمود یا مرکزی مضمون سے تعلق معلوم نہیں ہوتا، لیکن جب وہ بحث کو سمیٹتے ہوئے گفتگو کو ختم کرتا ہے تو خطبے کے تمام اجزاء اس خطبے کے مرکزی موضوع یا عمود سے مربوط نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت ایک خطبۂ خداوندی کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ قرآن حکیم کی ہر سورۂ مبارکہ کا اپنا معین مرکزی خیال، موضوع اور عمود ہے، اور نہ صرف یہ کہ پوری سورت اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے بلکہ جس طرح ایک حسین و جمیل ہار میں ہر موتی دوسرے موتی کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اسی طرح سورت کی تمام آیات باہم بھی مربوط ہوتی ہیں اور بحیثیت مجموعی سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ

بھی ان کا ربط قائم رہتا ہے۔

پھر یہی نہیں، بلکہ یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ مصحف جس ترتیب کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں بھی گہرا ربط موجود ہے اور اس کی تمام سورتیں بھی باہم مربوط اور ایک خاص ترتیب کے سلسلے میں منسلک ہیں۔ قرآن مجید کا ہر قاری اور ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن کی نزولی ترتیب بالکل مختلف تھی، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کی رہنمائی میں جس ترتیب سے قرآن حکیم کو مرتب فرمایا اور اُمت کے حوالے کیا وہ یہی ہے جو ہمارے پاس موجود ہے، اور یہ لوحِ محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ گویا یہی قرآن کی ازلی و ابدی ترتیب ہے! اس حقیقت کو اصطلاحاً ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ مصحف کی یہ ترتیب ''توقیفی'' ہے، یعنی جس کا علم نبی اکرم ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ اس لیے کہ مصحف کی یہ ترتیب خود آنحضور ﷺ نے اللہ کی اس ہدایت کے مطابق معین کی ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے آپؐ کو دی جاتی تھی۔ اب چونکہ اللہ حکیم ہی نہیں ''اَحکم الحاکمین'' ہے، لہٰذا قرآن حکیم کا ایک نہایت گہرا اور معنی خیز باطنی نظم ہے۔ اگرچہ قرآن کے اس داخلی نظام اور باطنی نظم کا فہم آسان کام نہیں ہے، بلکہ اس کی حکمتوں کے سمجھنے کے لیے بڑے عمیق غور و خوض اور گہرے تدبر و تفکر کی ضرورت ہے، اور اگرچہ فہم قرآن کے اس پہلو پر بھی الحمدللہ ہر دور میں مفید کام ہوتا رہا ہے لیکن قرآن مجید کے محاسن و عجائب، اس کے علوم و معارف اور اس کے حکم و عبر ایک اتھاہ سمندر کے مانند ہیں جو تا قیامِ قیامت کبھی ختم نہیں ہوگا۔ چنانچہ نظم قرآن کے ضمن میں بھی عہد حاضر کے ایک محقق مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے ان کی جانب پہلے توجہ نہیں ہوسکی تھی اور یقیناً آئندہ بھی اس کے مزید پہلو روشن ہوتے رہیں گے، لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ جہاں تک انسانی زندگی کی عملی رہنمائی کا تعلق ہے اس کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید نہایت سہل اور آسان کتاب ہے، جیسا کہ سورۃ القمر کی چار آیات (۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰) میں اللہ تعالیٰ نے بتکرار و اعادہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۝﴾

''اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو نصیحت اخذ کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا؟''

تیسری بات ابتدائی مکی سورتوں کے مخصوص امتیازی اسلوب و انداز سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ مکی دَور کے بھی آخری حصے میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان کا اسلوب ابتدائی مکیات سے مختلف اور مدنی سورتوں کے اسلوب سے مشابہ ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ''رنگ دگر'' زیادہ پختگی اور گہرائی کے ساتھ مدنی سورتوں ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی مکیات اور بعد کی سورتوں کے مابین جو فرق و تفاوت ہے' اس کو یوں سمجھئے کہ ابتدائی مکی سورتوں میں خطابت کا رنگ اور انداز نہایت نمایاں اور بہت گہرا ہے۔ چنانچہ ان میں جوش و خروش بھی زیادہ ہے اور زجر و توبیخ اور انذار و تنبیہہ بھی اس انداز کی حامل ہے جس کی بابت حالی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

چنانچہ اس کا کسی قدر اندازہ سورۃ القیامۃ کے ترجمے ہی سے ہو جاتا ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ بیان خطیب نہایت پُرجلال اور پُرہیبت انداز میں خطبہ دے رہا ہے۔

ابتدائی مکی سورتوں کا ایک دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں' جبکہ بعد کی مکیات اور تقریباً تمام مدنی سورتوں میں آیات کا طول اور حجم مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم ایک فوری تقابل کر سکتے ہیں۔ یہ سورۃ القیامہ ہے جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک ہے جس کا ہم فی الوقت مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے متصلاً قبل ہم نے سورۃ التغابن کا مطالعہ مکمل کیا ہے جو مدنی سورت ہے۔ وہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس سورۃ القیامۃ کے بھی دو رکوع ہیں۔ مصحف میں اگر آپ ان دونوں کے حجم کا تقابل کریں گے تو سورۃ القیامۃ' سورۃ التغابن کے تین چوتھائی سے بھی کم ہے' لیکن سورۃ

التغابن کی آیات کی تعداد اٹھارہ ہے اور سورۃ القیامہ کی آیات کی تعداد چالیس ہے۔ مزید برآں اکثر ابتدائی مکی سورتوں میں غنائیت اور ترنم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں قوافی کا لحاظ بھی نمایاں ہے اور بہاؤ بھی تیز ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جانب جوش وخروش اور دوسری جانب تیزی و روانی' ان دونوں کے امتزاج سے زبردست اثر انگیزی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ابتدائی مکی سورتوں میں بہت نمایاں ہیں' جبکہ آخری دَور کی مکیات اور بالخصوص مدنی سورتوں میں چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر آپ ایک مختلف انداز اور رنگ پائیں گے۔ چنانچہ ان میں آیات بھی طویل ہوگئی ہیں' بہاؤ بھی تیز نہیں ہے' بلکہ مضمون بڑے پرسکون انداز میں بالکل ایسے آگے بڑھتا ہے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ آیات کی طوالت کے باعث عام طور پر ان میں قوافی (فواصل) اور صوتی آہنگ کا بھی اتنا اہتمام نہیں رہتا جو ابتدائی مکیات کا خصوصی وصف ہے۔

سورۃ القیامۃ کے حوالے سے قرآن حکیم کے عظیم معجزہ ہونے کا ایک یہ پہلو بھی بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی زبان وادب کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ قرآن مجید کا عربی زبان پر یہ عظیم احسان تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ مختلف علاقائی ''بولیوں'' سے قطع نظر ادبی اور کتابی عربی کی روایت کا تسلسل اسی کے دم سے قائم و دائم ہے' اور اس طرح قرآن حکیم عربی زبان کو گویا ایک ستون کی مانند تھامے ہوئے ہے۔ چنانچہ اب بھی عربی ادب میں قرآن مجید کو بالکل وہی مقام حاصل ہے جو اِس کے نزول کے وقت تھا' اور اس کی بنیاد کسی مذہبی عقیدے یا عصبیت پر قائم نہیں ہے' اس لیے کہ کثیر تعداد میں ایسے یہود و نصاریٰ آج بھی موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ قرآن حکیم کے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونے پر یقین نہیں رکھتے' لیکن بایں ہمہ وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی ادب کا شاہکار ہے اور قرآن مجید کے اس وصف کے بارے میں ان کو بھی کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ اور اگرچہ یہ بات تو بہت تفصیل طلب ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے کہ قرآن حکیم کے اعجاز کے کون کون سے رُخ اور کون

کون سے پہلو ہیں‘ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے معانی‘ اس کے مطالب‘ اس کے مفاہیم‘ اس کا طرزِ استدلال‘ اس کی اثر انگیزی‘ اس کی علمی رہنمائی‘ اس کی روحانی و اخلاقی تعلیم‘ پھر انسان کے پیچیدہ ترین عمرانی اور تمدنی مسائل کا جو متوازن ومعتدل حل یہ پیش کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لیے جو کامل اور عدل وقسط پر مبنی دستور یہ عطا فرماتا ہے وہ سب اپنی جگہ اعجازِ قرآنی کے اہم اور عظیم مظہر ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرے گا اور نئے نئے حالات وواقعات سامنے آئیں گے اعجازِ قرآنی کے یہ پہلو مزید اُجاگر ہوں گے‘ لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت اس کے اعجاز کا جو پہلو سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا تھا وہ ہے اس کا اسلوب‘ ادبیت‘ خطابت‘ فصاحت‘ بلاغت‘ سلاست‘ حلاوت‘ تروتازگی‘ چاشنی اور اس کا جوش وخروش!—اور اس کے یہ تمام محاسن تاحال اسی طرح آفتابِ عالم تاب کی مانند قائم ہیں اور بحمداللہ قرآن حکیم کے بارے میں ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ آج بھی نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات صدفی صد درست اور ہر شائبہ سے پاک ہیں کہ: ((لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ))(۱) ’’اہل علم اس سے کبھی سیر نہ ہوسکیں گے‘ اور اس پر کثرت وتکرارِ تلاوت سے کبھی باسی پن طاری نہیں ہوگا (اس کے لطف اور اثر انگیزی میں کوئی کمی نہیں آئے گی) اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہوگا‘‘۔ گویا یہ قرآنِ مجید اور فرقانِ حمید ہمیشہ اسی طرح تابندہ‘ پائندہ اور تروتازہ کلام رہے گا جس طرح اپنے نزول کے وقت تھا۔ قرآن مجید کے یہ ادبی محاسن اگرچہ اس کے ایک ایک لفظ میں نمایاں ہیں‘ لیکن ان کا جس شدت کے ساتھ ظہور ابتدائی مکی سورتوں میں ہوا ہے اس کا ادراک اور شعور تو ہم غیر عرب عامیوں کو بھی بہت حد تک ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ سورۃ القیامہ اس کی ایک نہایت نمایاں مثال ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ کے ضمن میں اس تمہیدی گفتگو میں قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور بالخصوص ابتدائی مکی سورتوں اور بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے مابین انداز

---

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء فی فضل القرآن۔

اور اسلوب کے فرق کی جانب یہ اشارات کر دیے گئے۔ اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

پہلی دو آیات: قیامت کے دن اور نفسِ ملامت گر کی قسم

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ① وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ②﴾

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ـــــ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی!!''

سورۃ القیامۃ کی ابتدائی دو آیتوں میں وارد شدہ قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو کمالِ ایجاز و اعجاز کے ساتھ سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں شرح وبسط اور اطناب وتفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اِن دونوں قسموں کے نفسِ مضمون پر کلام سے قبل اس حرفِ نفی ''لَا'' کے بارے میں وضاحت مناسب ہے جو دونوں قسموں سے متصلاً قبل اور دونوں آیتوں کے شروع میں آیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے علاوہ قرآن مجید کی چھ مزید سورتوں (اَلْوَاقِعَة، اَلْحَاقَّة، المَعَارِج، التَّكْوِيْر، الْاِنْشِقَاق اور اَلْبَلَد) میں بھی وارد ہوا ہے' اور اس کے بارے میں اگرچہ بعض دوسری آراء اور تاویلات بھی موجود ہیں' تاہم بہترین رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ رسم الخط کے اعتبار سے تو ''لاءِ متصل'' نظر آتا ہے' لیکن واقعتاً ''لاءِ منفصل'' ہے' یعنی حرفِ نفی ''لَا'' علیحدہ ہے اور ''اُقْسِمُ'' علیحدہ۔ تاہم عربی زبان میں چونکہ انگریزی کی طرح علامتیں اور اوقاف نہیں ہیں لہٰذا یہ فرق اسلوبِ بیان اور مضمون کے سیاق وسباق پر غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسے یوں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کے جو سامعین ومخاطبین ہوتے ہیں' ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات' اعتراضات اور سوالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ خطیب ان کی تردید سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے ''لَا'' یعنی ہرگز نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں' تمہارے اشکالات باطل ہیں' تمہارے اعتراضات بے وزن ہیں ـــــ اور پھر اپنے موقف کو

بیان کرنے سے قبل اپنے یقین و اِذعان کے اظہار کے لیے کوئی قسم کھاتا ہے جس کے لیے لفظ ''اُقْسِمُ'' استعمال کرتا ہے' جیسے یہاں قسم کھائی گئی۔ یعنی ''میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی''۔ گویا قیامت اتنی یقینی' اتنی حتمی اور اتنی قطعی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ اسی طرح دوسری آیت پڑھئے: ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی''۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ یہ انداز و اسلوب خطیبانہ ہے۔ جیسے ایک خطیب پہلے سے جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین و حاضرین موجود ہیں اور اس کے جو مخاطبین ہیں' ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے' کیا کیا اشکالات اور کیا کیا اعتراضات ہیں' اور وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیاد پر قیامِ قیامت اور وقوعِ آخرت کو بالکل ناممکن اور بعید از قیاس سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا خطیب ان کے تمام اشکالات' اعتراضات اور وسوسوں کی نفی و تردید کے لیے لاءِ نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے۔

۱) قیامت کی قسم!

اور اب توجہ کو مرتکز کیجیے ان دو قسموں کے نفسِ مضمون پر۔ ان میں سے پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات و اشکالات ہیں' تمہارے دلوں میں وسوسے ہیں کہ دنیا کے آغاز سے لے کر قیامِ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان کیسے دوبارہ اٹھائے جا سکیں گے اور انہیں دوبارہ کیسے زندہ کیا جا سکے گا؟ پھر ان سب انسانوں کے جملہ اَعمال و اَفعال اور وہ بھی جملہ تفصیلات کے ساتھ کہاں محفوظ ہوں گے؟ مزید برآں ان اعمال و افعال کی پشت پر کارفرما نیّتیں اور ارادے کس کے علم میں ہوں گے؟ لہٰذا یہ محاسبہ اور جزا و سزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہو سکے گا؟ لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی' قطعی اور حتمی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں اس دن کی قسم کھاتا ہوں''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس میں دلیل کون سی ہے؟ اس لیے کہ اگر کوئی شخص کوئی دعویٰ پیش کرے اور اس سے اس دعوے کے لیے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھانے پر اکتفا کرے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ لیکن غور کرنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب اور اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے' اور وہ دلیل ہوتی ہے خود متکلم کی شخصیت کی۔ اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہو' جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہو' جب وہ کوئی بات کہتا ہے اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اُس کے قسم کھانے سے اس کی بات میں نمایاں وزن پیدا ہو جاتا ہے جو درحقیقت اور اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ یہاں قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں' قسم کھانے والا خود اللہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے والے صاحبِ ایمان پر تو اس کا لازمی اثر یہ پڑے گا کہ اس کا دل لرز جائے گا اور وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی' حتمی اور قطعی ہے کہ خود خالق کون ومکاں نے اس کی قسم کھائی ہے۔

رہے وہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے' تو وہ بھی اس قسم کو لامحالہ منسوب کریں گے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ اور اس صورت میں بھی اس قسم کی تاثیر ختم نہیں ہو گی بلکہ باقی رہے گی' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ اور سیرتِ مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود رہے گا کہ یہ قسم وہ کھا رہا ہے جس کی صداقت و امانت کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل سورۃ التغابن کی آیت ۷ کے الفاظِ مبارکہ ﴿قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ﴾ ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں! اور مجھے میرے ربّ کی قسم ہے کہ تم لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے' پھر تم لازماً جتلا دیے جاؤ گے جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو'' کی تشریح وتوضیح کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ سیرتِ مطہرہ کا اہم واقعہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل سے یہ پوچھا گیا کہ ''کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ محمدؐ جھوٹ بولتے ہیں؟'' تو اس نے کہا: ''ہرگز نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا''۔ پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ ''پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟'' تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ: ''اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ جاری

ہے۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے' انہوں نے مہمان نوازیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں' ہم اب تک ان کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ان کے تابع ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے کسی طور پر بھی گوارا نہیں''۔ معلوم ہوا کہ ابوجہل جیسا دشمنِ خدا و رسول بھی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کو حکم ہوا : ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحِجر: ۹۴) ''پس اب (اے نبیؐ!) آپ برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہیے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم ملا ہے''۔ اور آپؐ پہلے ''خطابِ عام'' کے لیے کوہِ صفا پر کھڑے ہوئے تو چونکہ اُس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی مقصود ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کسی بلند مقام پر بے لباس ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا ''وَاصَبَاحَاہ'' (ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے!) چنانچہ لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی وہ دور سے یہ دیکھ کر کہ ایک ''نذیرِ عریاں'' پہاڑی پر کھڑا ہے' اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس رواج میں یہ ترمیم فرماتے ہوئے کہ کپڑے نہیں اتارے' اس لیے کہ یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی اور آپؐ تو حیا کا پیکرِ اعظم تھے' باقی سارا معاملہ معمول کے مطابق کیا اور کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند فرمایا: ''وَاصَبَاحَاہ''۔ اور جب آپؐ کی یہ ندا سن کر اور آپؐ کو کوہِ صفا پر کھڑا دیکھ کر لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال کیا: ''لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا؟'' مجمع نے بیک زبان تسلیم کیا کہ آپؐ سچے بھی ہیں اور امانت دار بھی! لہٰذا جو لوگ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہیں مانتے اور اُن کے نزدیک اس کلام کے متکلم خود محمد (ﷺ) ہیں' ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا پورا وزن اور پورا زور اس قسم کی پشت پر موجود ہے کہ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝۱﴾ ''نہیں! مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی''۔ یعنی میں قیامت کے وقوع کو اتنا یقینی' قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس

کے یقینی اور شدنی ہونے پر خود اسی کی قسم کھاتا ہوں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ التغابن کی آیت ۷ میں نبی اکرم ﷺ سے جو قَسم کہلوائی گئی تھی اس کا بھی یہی مفاد اور انداز تھا۔ اصطلاح میں اس کو ''دلیلِ خطابی'' کہا جاتا ہے جس میں دلیل کی حیثیت متکلم کے اپنے یقینِ واثق اور اس کی اپنی بے داغ شخصیت اور اعلیٰ سیرت کو حاصل ہوتی ہے اور جس کے ذریعے متکلم کا یقین اور اذعان مخاطبین میں منتقل ہوتا اور سرایت کرتا ہے۔

۲) نفسِ ملامت گر کی قسم!

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف۔ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾ ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی''۔ اس بات کو ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کے باطن میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے جسے ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اسے اندر سے ضمیر کی خلش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اس لیے کہ برے سے برا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ برائی برائی ہے اور بدی بدی ہے' اور اگرچہ مختلف اسباب اور محرکات کے تحت وہ کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے' لیکن عین اُس وقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام برا ہے اور اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر اُسے اندر ہی اندر کچوکے دے رہا ہے۔ اسی احساس اور اسی کیفیت کو اِس آیت مبارکہ میں ''نفس لوامہ'' قرار دیا گیا ہے اور آیتِ مبارکہ میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس لیے کہ نفس انسانی کی یہ مضمر حقیقت جو عالمی اور آفاقی سطح پر مسلم سچائی کی حیثیت رکھتی ہے' وقوعِ قیامت پر سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ مؤثر دلیل ہے' جسے قرآن حکیم نے اسلوب اور الفاظ کے فرق اور تنوع کے ساتھ بہت سے مقامات پر' کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ' بیان کیا ہے۔

اس دلیل کا اگر کسی قدر تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے' ان میں تمیز کرتا اور اُن کے فرق و

تفاوت کو خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ گویا یہ پہچان اور یہ شعور فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ آخری پارے کی سورۃ الشّمس میں فرمایا گیا: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ ''اور گواہ ہے نفس انسانی اور جیسا کہ اسے بنایا اور سنوارا' پھر اس میں فجور و تقویٰ (برائی اور اچھائی اور بدی اور نیکی کا علم) الہامی طور پر ودیعت کر دیا''۔ چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے' وعدہ خلافی برائی ہے اور ایفائے عہد بھلائی ہے' کسی کو دھوکہ دینا شر ہے اور کسی کی صحیح رہنمائی کرنا خیر ہے' ظلم و استحصال اور تعدی و حق تلفی بدی کے کام ہیں' جبکہ عدل و انصاف' ہمدردی و خیر خواہی اور خدمتِ خلق نیکی کے کام ہیں۔ یہ سب عالمی اور آفاقی سچائیاں ہیں اور ان کے ضمن میں کہیں بھی انسانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کے حقیقت ہونے پر سب سے بڑا گواہ ہمارا اپنا ضمیر' ہمارا اپنا نفسِ ملامت گر اور ہمارا اپنا ذاتی احساس ہے' کہ اگر کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا کسی برے کام کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ برا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن معدودے چند لوگوں کا معاملہ ذہن سے نکال دیجیے جن کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو چکی ہو' جن کے دل پتھر بن گئے ہوں' جن کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو' جو اتنے کٹھور دل ہو چکے ہوں کہ انسانیت کی کوئی رمق بھی ان میں باقی نہ رہی ہو اور جن کی خود غرضی اور مفاد پرستی جملہ اخلاقی اقدار پر مسلط ہو چکی ہو۔ ان لوگوں کی حیثیت ان استثناءات کی ہے جو قواعد و کلیات کو مزید ثابت اور مؤکد کرتے ہیں۔ ورنہ قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی اور خیر و شر کے مابین واضح طور پر فرق اور تمیز کرتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی اس بدیہی حقیقت پر اگر عقل سلیم کے اس مسلمہ اصول کا اطلاق کیا جائے کہ ع ''گندم از گندم بروید' جو ز جو!'' تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو نیک اعمال کا اچھا صلہ ملنا چاہیے اور بد اعمالیوں کی سزا ملنی چاہیے' جبکہ فی الواقع جو صورت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اکثر و بیشتر تو بالکل ملتا ہی نہیں' اور اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت

سے نہیں ملتا۔ اسی طرح بدی کی سزا اکثر و بیشتر ملتی ہی نہیں' اور اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی۔ مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لائیے جس کی ہوسِ اقتدار اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے' لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں' کروڑوں بچے یتیم ہو گئے' ہزاروں افراد اپاہج ہو گئے' لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو گئے اور اُن کے مکین بے خانماں ہو گئے۔ نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنا بڑا اور ہولناک جانی و مالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوسِ ملک گیری اور نسلی برتری کے زعمِ باطل کے باعث پہنچا! اب اگر ہٹلر گرفتار ہو جاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی کر دیا جاتا تو کیا اسے اپنے جرائم کی پوری سزا مل جاتی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے خود اپنی زندگی ختم کر لی اور وہ اپنے جرائم کی دُنیوی سزا سے بالکل بچ گیا۔

معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ دنیا ناقص ہے۔ یہاں قوانین طبیعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آ رہے ہیں۔ آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں تو وہ جل جاتی ہے' آپ کوئی سم قاتل اور زہر ہلاہل کھائیں گے تو مر جائیں گے' لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتا' زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا' لوگ حرام خوریاں کرتے ہیں تو سب رچ پچ جاتا ہے' کسی نوع کے دردِ شکم تک سے سابقہ پیش نہیں آتا' لوگ حق تلفیاں کرتے ہیں' رشوتیں لیتے ہیں' جبر و استحصال اور ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں تو اس طرح جو جتنا مال دار اور دولت مند ہوتا ہے معاشرے میں اس کی اسی اعتبار سے عزت بڑھتی چلی جاتی ہے' حالانکہ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اس کی دولت مندی اور مال داری کی حقیقت کیا ہے اور کن ناجائز ذرائع سے اس نے دولت حاصل کی ہے۔ الغرض ایسے لوگ دنیا میں گلچھرے اڑاتے ہیں' عیش کرتے ہیں' آسودہ حال رہتے ہیں' صاحبِ عزت و شرف سمجھے جاتے ہیں' جن کے کوئی اصول نہیں ہیں' جو جائز و ناجائز' حرام و حلال اور خیر و شر کی تمیز اور اس بات کا رتی بھر لحاظ رکھے بغیر کہ ان کے اس طرزِ عمل سے قومی و ملی مفادات اور ملکی معیشت کو کتنا مہلک نقصان پہنچ رہا ہے' ہر نوع کی جعل سازی سے دن رات دولت

سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔اس کے برعکس ایسے لوگوں کے لیے زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں‘ حلال اور حرام میں فرق کریں‘ صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا پاس کریں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دُنیا نری اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے اور یہ تخلیق عبث اور بے مقصد ہے‘ ورنہ ایک دوسری زندگی کو ماننا لازم ٹھہرے گا‘ جس میں جزا و سزا کا قانون بھرپور طور پر بروئے کار آئے۔ یاد ہوگا کہ بالکل یہی بات سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران سامنے آ چکی ہے کہ: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾﴾ ’’اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد (بے کار اور عبث) پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک ہے (تو اس سے اعلیٰ و ارفع اور منزہ و مبرا ہے کہ کوئی کام بے کار و بے مقصد کرے! تیری تخلیق کا یہ محکم نظام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ملے گی۔) پس (اے ہمارے ربّ!) ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو!‘‘ لہٰذا عقل و منطق کی رو سے بدیہی طور پر لازم آتا ہے کہ اگر خیر خیر ہے اور شر شر ہے‘ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی لازماً ہونی چاہیے جس میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں‘ نیکی کا بھرپور صلہ اور پورا پورا بدلہ ملے اور بدی کی بھرپور سزا ملے۔ الغرض یہ ہے قرآن حکیم کا بدیہیاتِ فطرت پر مبنی استدلال جو وہ ع ’’اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں‘‘ کے مصداق مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر‘ کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ‘ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ القلم میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾﴾ یعنی سوچو تو سہی‘ کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ ایسا حکم لگاتے ہو؟۔ اگر واقعتاً کوئی اور زندگی نہیں ہے اور نہ کوئی آخرت ہے نہ محاسبہ‘ نہ جزا و سزا تو مجرم اور باغی تو مزے میں رہے کہ انہوں نے دنیا میں اس پر عمل کیا کہ ع ’’بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست‘‘۔ گویا عقلی اور منطقی طور پر ان لوگوں کی روش زیادہ درست اور مناسب ہے

جنہوں نے خیر وشر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا' جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال وحرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا یا پوری پوری سزا مل جائے۔

بہرحال یہ ہے خلاصہ اس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر صرف ایک قسم کے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے: ﴿وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾ ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی''۔ یہاں ذرا وہ بات بھی ذہن نشین کر لیجیے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں عرض کی گئی تھی کہ قسم کا اصل مقصد گواہی اور شہادت ہے۔ گویا وقوعِ قیامت پر ایک تو خود یومِ قیامت گواہ ہے' گویا ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' اور اگر وقوعِ قیامت پر کوئی اضافی گواہی مطلوب ہی ہے تو تمہارا اپنا ضمیر' تمہارا اپنا نفس ملامت گر گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے' لہٰذا اس کا بھرپور بدلہ جزا یا سزا کی صورت میں ملنا چاہیے جو اِس دنیا میں نہیں ملتا' چنانچہ اس کے لیے ایک دوسرا عالم ہونا عین عقل کا تقاضا ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس مقام پر اُس شخص کا حوالہ بھی دے دیا جائے جسے جدید مغربی فلسفے کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے' یعنی کانٹ' جس نے اپنے فلسفہ میں اخلاقی قانون کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی پہلی کتاب ''تنقید عقل خالص'' (Critique of Pure Reason) میں تو یہ ثابت کیا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کو کسی منطقی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر اپنی دوسری کتاب ''تنقید حکمت عملی'' (Critique of Practical Reason) میں یہ بات ثابت کی کہ وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اُس کے باطن اور اس کی فطرت میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ یہ خیر وشر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں سے آئی؟ خالص مادّے میں یہ شعور کیسے پیدا ہو گیا؟ انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی

شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اور بدی اور شر سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا کی ہستی پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں۔ ایک تو ہمارے اوپر یہ ستاروں بھرا آسمان خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور دوسری نشانی وہ اخلاقی قانون وشعور ہے جو فطرتِ انسانی میں مضمر اور ودیعت شدہ ہے۔ واضح رہے کہ کانٹ نے اخلاقی قانون کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لیے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے' جبکہ قرآن مجید اسے وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

منکرینِ آخرت پر ردّ وقدح

سورۃ القیامۃ کی ابتدائی دو آیات میں وارد شدہ قسموں کے بعد' جن کے بارے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے لیے قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے' منکرینِ آخرت کے اعتراضات اور شبہات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳﴾

''کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو ہرگز جمع نہیں کر سکیں گے؟''

پھر فرمایا:

﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝۴﴾

''کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس (انسان) کی ایک ایک پور کو برابر اور درست کر دیں۔''

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس اسلوب میں اصل وزن متکلم کی شخصیت کا ہوتا ہے' یعنی یہ کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے! پھر یہ کہ وہ کس یقین سے کہہ رہا ہے اور کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ یقیناً ہم کو اِس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم انسان کی انگلیوں کی ایک ایک پور اور اس کے ایک ایک ریشے کو درست کر دیں اور از سرِ نو بنا دیں۔ بظاہر تو یہ صرف ایک دلیلِ خطابی ہے' لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک عقلی اور منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا

وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے بعث بعد الموت اور قیامت و آخرت کے بارے میں گفتگو بے کار اور لا حاصل ہے۔ ایسے شخص سے تو پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا وہ اللہ کو ہر چیز پر قادر مانتا ہے؟ اگر اُس نے اللہ کو ''القدیر'' اور ''القادر'' مانا ہے تو اب اس کا اعتراض از خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے؟ تمہارے تمام شکوک وشبہات کے غبارے کی ہوا تو اللہ کو قادرِ مطلق تسلیم کرنے کے بعد خود بخود نکل جاتی ہے' اس لیے کہ جو ہستی ہر چیز پر قادر ہے وہی ہے جو مردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے گی۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیات (۳۶ تا ۴۰) میں وارد ہوئی ہے جہاں اس استفہامِ انکاری کے بعد کہ ''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟'' انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق کے اس حصے پر غور کرے جو اُس کے علم میں ہے' یعنی رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل جن سے اللہ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی تخلیقی قوتوں کا کسی درجے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا۔ پھر اُس نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اُسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اَعضاء و جوارح' یہ سماعت و بصارت' یہ شعور و اِدراک' یہ عقل و فہم' یہ غور و فکر کی استعداد اور حسی معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت' الغرض انسان کی حیران کن مشینری وجود میں آئی' اور اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تسویہ بھی ہوا' اور اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ مزید برآں اسی گندے پانی کی بوند سے کسی کو مرد بنا دیا کسی کو عورت' حالانکہ کوئی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ فرق نہیں کر سکتی کہ رحمِ مادر میں نشو ونما پانے والا ''نطفۂ اَمشاج'' یعنی مرد کے نطفہ اور عورت کے بیضہ کے اتحاد و امتزاج سے وجود میں آنے والا واحد خلیہ نر ہے یا مادہ۔ پھر ذرا انسان غور کرے کہ مرد اور عورت کا جسمانی نظام ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہے' اور اس پر بھی مستزاد اُن کی نفسیاتی ساخت اور

میلانات ورجحانات کے مابین کتنا فرق وتفاوت ہے! اور یہ سب کچھ اس گندے پانی کی بوند سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا نام زبان پر لانا بھی کوئی شائستہ اور مہذب انسان پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی یہ ساری خلاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس سب کے باوجود تمہیں یہ وسوسہ لاحق رہتا ہے اور تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ انسان کے مرجانے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے' یا جل کر راکھ ہو جانے یا کسی درندے یا مچھلی کی غذا بن جانے کے بعد اسے دوبارہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے اور کیسے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ اللہ جس کی خلاقی کا یہ عالم ہے کہ وہ گندے پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی تخلیق فرما دیتا ہے' اس پر قادر نہیں ہوگا کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے؟ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾﴾

''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کو (بلا باز پرس) یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا (ابتدا میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا بنا جسے پھر (اللہ نے انسان کی شکل میں) تخلیق فرمایا' پھر (اس کا) تسویہ فرمایا (اس کی نوک پلک سنواری)' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو جنسیں بنائیں۔ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کر سکے؟''

الغرض یہ ہے وہ انسان کے مشاہدے پر مبنی منطقی دلیل جو منکرینِ قیامت کے وسوسے اور ان کے استبعاد کا قطعی ابطال اور ان کے جملہ اعتراضات کی نفی کر دیتی ہے۔

واضح رہے کہ اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کا مثبت استدلال تو وہ تھا جو اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں وارد شدہ دو قسموں میں سے دوسری قسم میں اجمال کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ انسان کا ضمیر یا نفس لوامہ شاہد ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی میں امتیاز کرتی ہے۔ اب ایک جانب عقلِ انسانی مطالبہ کرتی ہے کہ ع ''گندم از گندم بروید'

جوز جو!'' کے مطابق نیکی کی بھرپور جزا اور بدی کی پوری پوری سزا ملنی چاہیے' اور دوسری جانب مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں فی الواقع ایسا نہیں ہو رہا' بلکہ بسا اوقات معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ دنیا ناقص ہے' چنانچہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ ملے۔ عقل کے اس مطالبے اور فطرت کے اس تقاضے کے مقابلے میں منکرینِ آخرت و قیامت کی جانب سے صرف ایک منفی دلیل پیش کی گئی۔ یعنی صرف یہ استبعاد اور استعجاب کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے اور اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں تو اسے دوبارہ اٹھا لیا جائے!

اس کا ایک جواب تو خطابی انداز میں دیا گیا: ﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝۴﴾ ''کیوں نہیں! (ہم تو) اس کی انگلیوں کی پوروں تک کو درست کرنے پر قادر ہیں''۔ جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم اللہ کو مانتے ہو اور اسے ہر چیز پر قادر جانتے ہو تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی' اور دوسرا جواب انسان کی رحمِ مادر میں جنین کی حیثیت سے تخلیق کے حوالے سے دیا گیا۔ کس کے لیے ممکن ہے کہ اس ہستی کی قدرت اور تخلیقی قوت کا اندازہ کر سکے جو ایک گندے پانی کی بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے؟ کیا وہ قادرِ مطلق تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا؟ ظاہر بات ہے کہ اس سوال کا جواب ہر سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا۔ چنانچہ یہی بات ہمیں نبی اکرم ﷺ نے اس طرح تلقین فرمائی کہ آپؐ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپؐ اس سورۃ کے اختتام کے بعد فرمایا کرتے تھے: ((بَلٰی))(۱) ''کیوں نہیں!'' (ہم اس پر گواہ ہیں کہ ہمارا رب مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔)''

انکارِ آخرت کے اسباب

اس سورۂ مبارکہ میں دوسرا اہم مضمون یہ سامنے آیا کہ اگر منکرین کا یہ اعتراض منطق اور عقل کی رو سے بالکلیہ باطل اور قطعاً بے وزن ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے اور یہ قیامت و آخرت کے منکر کیوں ہیں' اس کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب مقدار الرکوع والسجود۔ ومسند احمد: ۷۰۸۶۔

کے تین نہایت اہم اور بنیادی سبب بیان کیے گئے۔

۱) فسق و فجور کی عادت: اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب انسان فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے' وہ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والی عیش کا خوگر ہو جاتا ہے اور لذت کوشی اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے تو ان سب کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ آخرت کو مانے تو اسے حلال و حرام میں تمیز کرنی پڑے گی اور جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس طرح کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے (حالانکہ اس طرح سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی)' اسی طرح وہ لوگ جو فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں' بلکہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں' وہ آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ روایتی کبوتر کی مانند قیامت و آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا منکرینِ قیامت و آخرت کے انکار کا اصل سبب منطقی ہے نہ عقلی' بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حرام خوری اور فسق و فجور کی روش اور لا اُبالیانہ طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵﴾ یعنی ان کے اعراض و انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسق و فجور کی روش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں!

۲) دُنیا کی محبت: آخرت اور قیامت کے انکار کا دوسرا سبب دُنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱﴾

''ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ عاجلہ سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو!''

یعنی تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو' اور اس کے پرستار بن گئے ہو۔ لفظ ''عاجلہ'' عجلت سے بنا ہے' اس سے مراد ''دُنیا'' ہے۔ اس لیے کہ اس کا نفع بھی فوری اور نقد ہے اور نقصان بھی فوری اور نقد ہے۔ اس کی لذتیں بھی بالفعل محسوس

ہوتی ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔تم اس عاجلہ سے دل لگائے ہوئے ہواور آخرت کی زندگی کونظر انداز اور فراموش کیے ہوئے ہو۔ یہاں عاجلہ کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرا دی گئی کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور فوری آسائشوں کو قربان نہیں کر سکتے' وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔اس کے برعکس جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور جو دُور اندیش اور دُور بین ہوتے ہیں وہ فوری راحت و آرام کو تج دیتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں' یہاں تک کہ راتوں کو جاگتے ہیں تا کہ اپنے دُنیوی کیریئر کو روشن بنا سکیں۔ بالکل اسی طرح جو لوگ دنیا کی فوری لذت اور عیش و راحت کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے' جو اس عاجلہ (دُنیا) کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس عروسِ ہزار داماد کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت سے غافل رہتے ہیں اور اللہ کی جناب میں محاسبہ کے لیے کھڑے ہونے کو فراموش کر دیتے ہیں' وہ اُخروی زندگی میں لامحالہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔لیکن افسوس کہ انسان مختصر سی حیاتِ دُنیوی میں تو مستقبل سے غافل نہیں ہوتا' لیکن آخرت کی ابدی زندگی سے غافل رہتا ہے اور حیاتِ دُنیوی کو اِس انداز سے بسر کر دیتا ہے کہ: ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو حکیمانہ اشعار میں دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا نقشہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچ دیا ہے: ؎

يَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللُّؤَالِي
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِي
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى مِن غَيْرِ كَدٍّ
اَضَاعَ الْعُمْرَ فِيْ طَلَبِ الْمَحَالِي

''جو موتیوں کا طالب ہوتا ہے لامحالہ سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جو بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر محنت و مشقت کے بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنی عمر ناممکن چیز کی خواہش میں ضائع کر دیتا ہے۔''

گویا بقول حالی مرحوم: ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

افسوس کہ دنیا میں ایسے انسان تو پھر بھی بہت سے مل جاتے ہیں جو دنیا کے حصول کے لیے محنت و مشقت بھی کرتے ہیں اور راحت و آرام کو بھی تج دیتے ہیں' لیکن آخرت کی کامیابی کے حصول کے لیے اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے والے بہت ہی کم ہیں!

۳) **تکبر و تمرد**: اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت و آخرت کا جو تیسرا اہم سبب بیان کیا گیا ہے وہ تکبر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾﴾

''پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔''

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیر قرآن سے خصوصی شغف تھا' وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے' لیکن یہاں معین طور پر ابوجہل مراد ہے۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ابوجہل کے اعراض و انکار اور کفر و تکذیب کا سب سے بڑا سبب تکبر تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے نیچا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا' اسی لیے اس نے تصدیق نہیں کی۔ ''فَلَا صَدَّقَ'' میں اس کی اسی روش کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتا جو خبر دے رہے تھے وقوعِ قیامت کی اور جو مدعی تھے اللہ کے نبی اور

رسول ہونے کے‘ تو آپؐ کی تصدیق کے لازمی معنی یہ ہوتے کہ وہ آپؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا اور آپؐ کی اطاعت کلی قبول کرتا ہے‘ اور اس کے لیے اس کی متکبرانہ طبیعت آمادہ نہیں تھی۔ اسی طرح جو شخص نماز پڑھتا ہے وہ ہمہ تن اللہ کے سامنے جھکتا ہے‘ جس کا نقطۂ آغاز ہے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑے ہونا‘ اور پھر درمیانی مقام ہے حالتِ رکوع‘ اور اس کی انتہا ہے حالتِ سجدہ۔ اب بہت سے انسان اتنے سرکش اور متمرد ہوتے ہیں کہ ان کی اکڑی ہوئی گردنیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ الغرض تصدیق اور نماز کی راہ میں رکاوٹ اور انکار و تکذیب پر آمادہ کرنے والی اہم چیز ہے تکبر و تمرد‘ جس کا نقشہ کھینچ دیا گیا ان الفاظِ مبارکہ سے کہ: ﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝۳۳﴾ ’’پھر وہ چل دیا اپنے گھر والوں کی جانب اکڑتا اور اینٹھتا ہوا!‘‘

تین ہولناک مناظر کی نقشہ کشی

اب اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے اہم حصے کی جانب توجہ منعطف کیجیے جو تین مواقع کی منظر کشی پر مشتمل ہے‘ جن کی ایسی کامل تصویرِ لفظی پیش کر دی گئی ہے کہ نگاہوں کے سامنے پورا نقشہ آ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک نقشہ ہے ’’اَلسَّاعَة‘‘ کا‘ یعنی وہ بڑی ہلچل جو اِس کائنات کے نظام میں آنے والی ہے‘ جس کے بارے میں سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱﴾ ’’اے لوگو! اپنے پروردگار (اور اپنے آقا) کا تقویٰ اختیار کرو (اور اس کی نافرمانی سے بچو)‘ واقعہ یہ ہے کہ ’اَلسَّاعَةُ‘ کا زلزلہ بڑی خوفناک چیز (اور بہت ہولناک واقعہ) ہوگا!‘‘ یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ ہے جسے قرآن مجید یہاں ’’اَلسَّاعَةُ‘‘ سے موسوم کرتا ہے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر اَلْقَارِعَةُ‘ اَلْحَاقَّةُ‘ اَلطَّاغِيَةُ‘ اَلصَّاخَّةُ اور اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى بھی فرمایا گیا۔ اُس ’’اَلسَّاعَةُ‘‘ کا نقشہ اس سورۂ مبارکہ میں یوں کھینچا گیا:

﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾

’’پس جب نگاہ چندھیا جائے گی‘ اور چاند بے نور ہو جائے گا‘ اور سورج اور چاند

ایک کر دیے جائیں گے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ کششِ ثقل کا جو باہمی نظام ہے' اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ بڑے بڑے کرے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور چاند سورج میں دھنس جائے گا۔ تو یہ اس ''اَلسَّاعَة'' کے ابتدائی احوال ہیں۔ جب یہ کیفیت نظر آئے گی تو یہی انسان جو اِس وقت اکڑ رہا ہے' بڑے متکبرانہ انداز میں چیلنج کر رہا ہے کہ: ﴿یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝۶﴾ ''(تحدی کے ساتھ) پوچھتا ہے کہ کب ہوگا قیامت کا دن؟'' اس روز اس کا یہ حال ہوگا کہ ﴿یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰﴾ ''یہ انسان کہہ رہا ہوگا کہ ہے کوئی جائے فرار؟ (ہے کوئی پناہ گاہ؟)'' جواباً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے:

﴿کَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳﴾

''ہرگز نہیں! (اُس روز) کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ اُس روز تو تیرے ربّ ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ (اُس روز) انسان کو جتلا دیا جائے گا جو کچھ اس نے آگے کیا (یا آگے بھیجا) اور جو کچھ پیچھے کیا (یا پیچھے چھوڑا)!''

یہ ایک نقشہ تو ''اَلسَّاعَة'' کا ہے جو کھینچا گیا ہے۔ دوسرا نقشہ ہے ''یَوْمُ الْقِیَامَةِ'' کا ـــــ جس روز لوگ اپنے ربّ کے حضور میں کھڑے ہوں گے' نتیجہ کا اعلان ہونے والا ہوگا۔ جیسے کہ آپ نے اسکولوں میں دیکھا ہوگا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالب علم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ گویا ان کے چہروں پر پہلے ہی سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو کامیاب ہونے والے ہوتے ہیں' جن کو معلوم ہے کہ ہم امتحان کے پرچے اچھے کر کے آئے ہیں' ان کے چہرے تر و تازہ ہوتے ہیں' انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں' وہ نتیجہ کے متعلق خود جانتے ہیں کہ وہ کیا ہوگا! اسی کیفیت کو اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۱۴' ۱۵ میں یوں فرمایا گیا:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ۝۱۵﴾

''بلکہ انسان اپنے لیے خود ہی دلیل ہے (ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے!) خواہ وہ کتنے ہی بہانے تراشے اور معذرتیں پیش کرے (اور اپنی چرب زبانی سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کر دے)۔''

لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات اور اپنے اصل محرکاتِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا جب لوگ بارگاہِ ربّ العزت میں کھڑے ہوں گے تو ان کے چہروں پر ان کا انجام' ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوا ہوگا۔ اسی بات کو اگلی آیات (۲۲ تا ۲۵) میں فرمایا گیا:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾

''اُس روز بہت سے چہرے ہوں گے تروتازہ (اور شاداں وفرحاں) اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار (یا اپنے پروردگار کی جانب دیکھتے ہوئے)''۔

اس کے برعکس کچھ لوگوں کا حال یہ ہوگا:

﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾﴾

''اور کچھ چہرے ہوں گے اُس دن سوکھے ہوئے (اداس اور افسردہ و پریشان)۔ اس خیال سے (لرز رہے ہوں گے) کہ اب اُن کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے۔''

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا' وہ ہے قیامت صغریٰ یعنی عالمِ نزع کا نقشہ' جب اس دنیا سے روانگی کا وقت ہوتا ہے اور انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اپنے اہل وعیال اور مال و منال سے جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ)) (۱)

''جو مر گیا تو اس کی قیامت تو واقع ہوگئی۔''

یعنی دنیا کی مہلتِ عمل ختم ہوگئی' جیسا کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا' لکھنا بند کر دیا جائے اور قلم رکھ دیے جائیں۔ تو یہ موت درحقیقت مہلتِ عمل کے خاتمے کا نام ہے اور وقوعِ جزا وسزا کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے۔ اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا:

﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾﴾

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی ٤/٧٩۔ وسلسلة الاحادیث الضعیفة للالبانی:١١٦٦۔

''ہرگز نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی' اور کہا جائے گا (یعنی تیمار دار کہیں گے) ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟''

یعنی اب تو ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں اور معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس موقع پر بسا اوقات بڑے سے بڑا عقلیت پرست بھی اس تگ و دو میں لگ جاتا ہے کہ کوئی ٹونا ٹوٹکا ہی کام کر جائے اور کسی تیر تکے ہی سے کام چل جائے۔

﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾﴾

''اور اسے یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا وقت آن پہنچا ہے' اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہو گی۔''

اگلی آیت میں جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ دنیا سے آخرت کی جانب انتقال (نقل مکانی) کے مختلف مراحل کی نہایت جامع اور فصیح و بلیغ تعبیر ہے' یعنی:

﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾﴾

''(اُس روز کہا جائے گا) آج تو تجھے اپنے ربّ کی طرف ہی جانا ہے (چار و ناچار' کشاں کشاں)۔''

الغرض یہ تین نقشے ہیں جن کو پیش کرنے سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ جو لوگ آخرت اور قیامت کے منکر ہیں' جو کبوتر کی مانند اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں' جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے' اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں سن رہے' اس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے' نفس ملامت گر کی پروا نہیں کر رہے' جو عقل و خرد اور فہم و ادراک نیز شعور سے کام نہیں لے رہے' ان کے باطن کی بصیرت شاید اِن واقعات و حالات کی تذکیر سے جاگ جائے جن کا وقوع پذیر ہونا یقینی' قطعی اور حتمی ہے' جیسا کہ سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾﴾

''بلاشبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے (حق ہے) اور یقیناً جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی''۔

گویا جو لوگ ان حقائق کو اپنے شعور و ادراک سے دُور رکھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف

سے اپنی نگاہیں بند کیے ہوئے ہیں' اور جو خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں' ان نیند کے متوالوں کو اس سورۂ مبارکہ میں مؤثر ترین اسالیب سے جگایا جا رہا ہے۔ اور جو اس کے باوجود نہ جاگیں' بلکہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے رہیں ان کے لیے سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۴' ۳۵ میں فرمایا:

﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ ﴾

''(اے غفلت شعار!) تیرے لیے افسوس اور ہلاکت ہے۔ پھر تیرے لیے افسوس اور بربادی ہے!''

اللہ تعالیٰ ہمیں اِس انجامِ بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں آخرت کا یقین بھی پیدا فرمادے اور ''زَلْزَلَةُ السَّاعَة'' اور ''أهوالُ القيامة'' کی سختیاں آسان فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے' آمین!

عجلت خیر میں بھی پسندیدہ نہیں

وقوعِ قیامت اور اثباتِ قیامت کے ضمن میں منکرین کے اعتراضات' اشکالات اور شبہات کے جواب کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد اب ہمیں ان چار آیات (۱۶ تا ۱۹) کا مطالعہ کرنا ہے جن میں خطاب براہِ راست نبی اکرم ﷺ سے ہے اور جن میں اوّلاً آپؐ کو تحصیل قرآن کے ضمن میں فرطِ شوق و اشتیاق کی بنا پر عجلت پسندی سے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ متن قرآن کے ضمن میں جمع و ترتیب اور مطالبِ قرآن کے ضمن میں تفتیش و تدقیق کے لیے آپؐ کو زحمت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے' ان جملہ امور کی کامل ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ تو آیئے پہلے ان آیاتِ مبارکہ کا ایک سلیس و رواں ترجمہ سامنے رکھ لیں اور پھر اِن میں سے مقدم الذکر مضمون پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غور کریں۔

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾ ﴾

''(اے نبیؐ!) آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت

مت دیا کیجیے کہ اسے جلدی سے حاصل کرلیں۔ یقیناً ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ تو پھر جب ہم اسے (فرشتے کی زبانی) پڑھ چکیں تو اس پڑھنے کی آپ (بھی) پیروی کیجیے۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت بھی!''

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویل خطاب ہوتا رہتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب تھا' پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہو گیا۔ مزید برآں کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کر کے گفتگو کرتا ہے اور کبھی غائب کو حاضر فرض کر کے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں اس کی ایک نمایاں مثال زیر مطالعہ آیات کی صورت میں موجود ہے۔ اس لیے کہ یہ سورۂ مبارکہ از اوّل تا آخر مختلف اسالیب سے منکرینِ قیامت کے ساتھ بحث و گفتگو اور ردّ و قدح پر مشتمل ہے' لیکن درمیان میں خطاب کا رُخ نبی اکرم ﷺ کی جانب مڑ گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اِس سورۂ مبارکہ کے اصل مضمون کے ساتھ اِس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لیے کہ چاہے کسی سلسلۂ کلام میں کوئی بات ضمنی طور پر آئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ کلام کے عمود کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ربط ضرور ہوتا ہے' خواہ وہ کتنا ہی ''خفی'' ہو۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا ایک اہم اور بنیادی سبب ''حب عاجلہ'' کو قرار دیا گیا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾﴾

''ہرگز نہیں' بلکہ (تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ) تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہو۔ اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔''

یعنی انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ ''عاجلہ'' یعنی دنیا سے دل لگا بیٹھتا ہے' اس لیے کہ اس کی لذتیں بھی فی الفور محسوس ہوتی ہیں اور انسان ان سے شاد کام ہوتا ہے اور اس کی کلفتیں اور اذیتیں بھی انسان کو فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ گویا دنیا کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی۔ چنانچہ جب یہ ''عاجلہ'' انسان کا اصل مطلوب و مقصود بن جاتی ہے تو اس کائنات اور اس کی تخلیق کے وسیع ترین حقائق اور بلند ترین مقاصد انسان کی نگاہوں سے خود بخود اوجھل ہو جاتے ہیں اور انسان کا شعور ان سے محجوب ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ

آخرت کو مختلف غلط تاویلات سے نظر انداز کر دیتا ہے' بلکہ اس پر اعتراضات' اشکالات اور شبہات وارد کرتا ہے' حتیٰ کہ اسے محالِ مطلق گردانتا ہے اور اس کا انکار کر دیتا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف لفظی مناسبت سے بات کا رُخ رسول اکرم ﷺ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾﴾ ''(اے نبیؐ!) آپ قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں کہ اس کو جلدی سے حاصل کر لیں (یا یاد کر لیں)''۔ یہاں عجلت کے ذکر سے اس عظیم حقیقت کی جانب اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ ''عجلت پسندی'' وہ چیز ہے جو خیر کے لیے بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ ''سہج پکے سو میٹھا ہو'' کے مصداق خیر اور نیکی کے کاموں میں بھی مناسب تدریج اور میانہ روی پیش نظر رہنی چاہیے' تب ہی ان میں تمکن و استحکام بھی پیدا ہوتا ہے اور نتائج بھی صحیح اور متوازن طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ الغرض یہ تو ایک بڑے لطیف معنوی ربط کی بات تھی جس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی طرف خطاب کا رُخ مڑ گیا۔

البتہ یہاں عجلت پسندی کے متعلق یہ بات بھی نوٹ کر لی جائے تو مناسب ہوگا کہ قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾ (آیت ۳۷) ''انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے''۔ یعنی انسان کی خلقت اور سرشت میں جلد بازی کا عنصر شامل ہے۔ یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو سورۃ النساء میں وارد ہوا کہ: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی خلقت اور سرشت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں' جن میں سے ایک عجلت پسندی بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾﴾ ''اور انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے''۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رُخ شر اور نفس پرستی کی طرف ہو جائے تب تو اس کی تباہ کاری اور ہولناکی اظہر من الشّمس ہے ہی' لیکن اگر عجلت پسندی کا رُخ خیر کی جانب ہو تب بھی یہ ایک غیر مطلوب اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال سورۂ طٰہٰ میں آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ

نے طلب فرمایا تو آنجناب علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا :﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾﴾ ''اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ؟'' یعنی تم وقتِ مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آ گئے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً عرض کیا:﴿هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾﴾ ''(پروردگار!) وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور اے میرے ربّ! میں تو تیری طرف جلدی کر کے اس لیے آیا ہوں کہ تو راضی ہو جائے''۔ گویا وہ جو ایک مشہور مصرع ہے ع ''تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ!'' اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجیے کہ ع ''تو میرا شوق دیکھ، مرا اشتیاق دیکھ!'' یعنی میں تو اے ربّ! تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کر کے پہلے آ گیا ہوں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب ملاحظہ فرمائیے:﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾﴾ ''(اللہ نے) فرمایا تو (اے موسیٰ! تمہاری عجلت کا نتیجہ یہ نکل چکا ہے کہ) ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے''۔ معلوم ہوا کہ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور مخاطبۂ الٰہی سے شاد کام ہونے کے اشتیاق پر مبنی تھی، جو سراسر خیر اور ہر اعتبار سے قابلِ تعریف جذبہ ہے، لیکن عالمِ واقعہ میں اس کا بھی ناپسندیدہ نتیجہ ظاہر ہوا۔

اسی سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرمایا گیا:﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور (اے نبیؐ!) آپ جلدی نہ کریں قرآن کے حاصل کر لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے آپ کی طرف اس کا اترنا، اور آپ دُعا کریں: اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما!'' یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کا ذوق وشوق ہمارے علم میں ہے۔ آپ کا یہ اشتیاق اپنی جگہ! لیکن ہم نے نزولِ قرآن کے لیے ایک ترتیب اور ایک تدریج مقرر کر رکھی ہے۔ ہماری حکمتِ بالغہ میں اس کا جو بھی وقتِ معین ہے، اس کا نزول اسی کے مطابق ہوگا۔ رہی علم کی وہ پیاس جو آپ کو اپنے قلبِ مبارک میں شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے، تو اس کے لیے آپ دعا کرتے

رہا کیجیے کہ ''اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما!''

سورۂ مریم میں یہی مضمون اس انداز میں وارد ہوا ہے کہ آنحضورﷺ کے شوق و اشتیاق اور وحی کے انتظار کے متعلق حضرت جبرائیل علیہ السلام سے کہلوایا گیا: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾﴾ ''اور ہم آپ کے ربّ کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اُسی کو ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اس کا اختیار بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے' اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی (کلیتًا) اسی کے پاس ہے۔ اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے!'' — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے شکوہ کیا ہوگا کہ آپ دیر دیر سے اور وقفہ دے کر آتے ہیں' جبکہ ہمیں وحی کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا جواب ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے دلوایا کہ ہم اللہ کے حکم سے وحی لے کر آتے ہیں۔ اُس کا علم کامل ہے' کائنات کی کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تاخیر و تعویق اس کے کسی نسیان کے باعث نہیں ہے' بلکہ اس کی حکمتِ بالغہ کے مطابق ہے۔

پھر اسی سورۂ مریم میں نبی اکرمﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾﴾ ''پس (اے نبیؐ!) آپ ان (کافروں) پر (عذاب کے نزول کے لیے) جلدی نہ کیجیے۔ بالتحقیق ہم ان کے لیے (دن) گن رہے ہیں''۔ یعنی یہ کفار و مشرکین ہماری گرفت میں ہیں' کہیں بھاگ کر نہیں جا سکیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس کے لیے بھی ایک مہلت ہمارے علم کامل اور حکمتِ بالغہ میں معین ہے — اور جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾﴾ ''پس (اے نبیؐ!) ان کافروں کو ڈھیل دیجیے! ان کو ذرا سی دیر اِن کے حال پر چھوڑ دیجیے''۔ ان کے لیے جو ڈھیل اور مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسے ختم ہو لینے دیجیے! ہمارے علم کامل میں ہر چیز کا وقت معین ہے۔ اجل مسمّٰی کو کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ اور جب وہ وقتِ معین آ جائے گا تو اِن کا حساب پاک کر دیا

جائے گا۔

الغرض یہاں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اے نبیؐ! آپ قرآن کو یاد کرنے کے لیے جلدی نہ کیا کیجیے اور اس کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیا کیجیے ـــــ اور اس مضمون کو عجلت کی لفظی مناسبت کی بنا پر سورۃ القیامۃ میں نگینے کے مانند جڑ دیا گیا کہ عجلت پسندی تو وہ شے ہے جو نیکی اور خیر کے کاموں کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی' کجا یہ کہ انسان پر ''حب عاجلہ'' کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی ساری جدوجہد' سعی ومحنت اور تگ ودَو کا مقصود ومطلوب ہی صرف ''عاجلہ'' یعنی دنیا کی دولت وثروت اور جاہ وحشمت کا حصول بن کر رہ جائے۔ تو اس کے جو خراب نتائج نکلیں گے ان کا تم خود بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ اس پورے مفہوم کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان دو آیات میں سمو دیا گیا۔ یعنی تمہاری تمام تر گمراہی اور ضلالت' کفر وتکذیب' اور اعراض وانکار کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ (اس دُنیا) کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔

یہاں ضمناً ایک وضاحت ضروری ہے' اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں ''سَارِعُوْا'' اور ''سَابِقُوْا'' کے الفاظ بھی متعدد مقامات پر وارد ہوئے ہیں' جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (آیت ۱۳۳) ''اور دوڑ لگاؤ اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف!'' اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے نکلو اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف!'' ''سَارِعُوْا'' اور ''سَابِقُوْا'' فعلِ امر کے صیغے ہیں۔ سورۃ المؤمنون کی آیت ۶۱ میں مؤمنینِ صادقین کے اوصاف کے ضمن میں یہ دونوں الفاظ خبریہ انداز میں فعلِ مضارع اور اسمِ فاعل کی صورت میں وارد ہوئے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝۶۱﴾ ''یہی لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لیے تیز گام ہیں اور اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں''۔ سَرِعَ ' یَسْرَعُ سے بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے ''مُسَارَعَةٌ'' اور سَبَقَ' یَسْبِقُ سے بابِ مفاعلہ ہی کا مصدر ہے ''مُسَابَقَةٌ'' ـــــ اور یہ

دونوں قریب المفہوم اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑ لگانا۔ البتہ مسارعت و مسابقت اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے عجلت پسندی سے قدرے مختلف شے ہے۔ واضح رہے کہ مسارعت اور مسابقت کا جذبہ بھی طبعِ انسانی میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ چنانچہ ہر انسان دوسرے لوگوں سے آگے نکلنا اور بڑھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسارعت و مسابقت کے اس جذبہ کے رُخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو تعلیم دیتا اور تلقین کرتا ہے کہ ''دُنیا'' یعنی دُنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی و کوشش کرنے کے بجائے تم بھلائیوں میں، نیکیوں میں، خیر میں، خدمت خلق میں، عبادات کی بجا آوری میں، دین کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں، دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی سعی و جہد میں اور اقامت دین اور غلبۂ دین کے لیے انفاقِ مال اور بذلِ نفس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ اللہ کی مغفرت اور جنت کے شاہ درے ہیں۔

البتہ ہر کام کے لیے مناسب تدریج بھی ضروری ہے اور اس کی جملہ شرائط کو پورا کرنے میں جو مناسب وقت لگنا چاہیے اس کے ضمن میں صبر کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔ جیسے اگر نماز کو بہت جلدی جلدی پڑھا جا رہا ہو تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایسی نماز ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدوی مسلمان نے مسجد نبویؐ میں آ کر جلدی جلدی نماز پڑھ لی تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ((**فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ**))(۱) ''دوبارہ نماز پڑھ، اس لیے کہ تیری نماز ادا نہیں ہوئی''۔ لہٰذا نماز کے ہر رکن کا حق پورے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح اگرچہ قرآن حکیم میں نمازِ جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿**إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ**﴾ (آیت ۹) جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''جب نمازِ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراء ۃ للامام والماموم فی الصلوات کلھا..... وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراء ۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ وانہ اذا لم یحسن۔

جمعہ کے لیے بلایا جائے (اذان ہو جائے) تو اللہ کی یاد کے لیے دوڑو‘‘۔لیکن تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں سعی (فَاسْعَوْا) سے دوڑنا مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ نماز کے لیے دوڑ کر آنے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے‘ یہ وقار اور سکینت کے منافی ہے۔لہٰذا یہاں سعی سے مراد لپکنا ہوگا۔یعنی اپنے تمام کاموں سے ذہنی وعملی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز کے لیے لپکو اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اللہ کی جانب سے متنِ قرآن کی حفاظت اور معانیٔ قرآن کی وضاحت کی ضمانت

آیت ۱۶ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جو بات فرمائی گئی‘ یعنی آنحضور ﷺ کو اپنی زبانِ مبارک کو قرآن حکیم کے ساتھ تیزی سے حرکت دینے سے کمالِ شفقت ومحبت کے ساتھ روکا گیا‘ تو آپؐ کے اس طرزِ عمل کا ایک سبب تو وہ تھا جو جلی انداز میں بیان کر دیا گیا‘ یعنی آپؐ کی قرآن حکیم کے ساتھ غایت درجہ کی محبت اور اس کا حد درجہ شوق‘ جس کے نتیجے میں آپؐ نازل شدہ آیاتِ قرآنی کو جلد از جلد یاد کر لینا چاہتے تھے تاکہ مزید وحی نازل ہو—— لیکن آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے وحیٔ قرآنی کو یاد کرنے کے لیے تیزی سے زبانِ مبارک کو حرکت دینے اور اس طرح شدید مشقت برداشت کرنے کا ایک دوسرا سبب بھی تھا‘ اور وہ یہ کہ آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ وحی کے الفاظ کو اچھی طرح یاد کر لیں‘ مبادا اس کا کوئی حصہ آپؐ کی یادداشت میں محفوظ نہ رہے اور اس طرح قرآن مجید کا کوئی لفظ یا کوئی آیت ضائع ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ کی اس تشویش کو رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ ’’یقیناً ہمارے ذمے ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا بھی اور اس کا پڑھنا (یا پڑھوانا) بھی!‘‘

وجوبِ حفاظتِ قرآن

یہ آیۂ مبارکہ جمع وترتیب قرآن اور حفاظتِ متن قرآن کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت کی حیثیت رکھتی ہے‘ اس لیے کہ اگرچہ سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں بھی

حفاظتِ قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا پختہ وعدہ وارد ہوا ہے کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹﴾ ''یقیناً ہم نے ہی اس نصیحت (اور یاد دہانی) کو نازل فرمایا ہے اور خود ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ اس موضوع پر قرآن حکیم کا ذروۂ سنام سورۃ القیامۃ کی آیت ۱۷ ہی ہے' اس لیے کہ ایک تو اس میں حفاظت کی مزید وضاحت دو الفاظ کے ذریعے کی گئی' یعنی ''جَمْعَهٗ'' اور ''قُرْاٰنَهٗ'' اور دوسرے اس (عَلَيْنَا) میں جو حرفِ جار ''عَلٰی'' وارد ہوا ہے اس کا لازمی نتیجہ ''وجوب'' ہے' یعنی جمع و ترتیبِ قرآن اور حفاظتِ متن قرآن کو اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔ اور اگرچہ اہل سنت ایک کلامی اختلاف کے باعث اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا ''وجوب'' تسلیم نہیں کرتے' لہٰذا اس مقام پر اس سے مراد ''وجوب'' نہیں بلکہ ''وعدہ'' لیتے ہیں' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا حاصل بھی وہی ہے' اس لیے کہ اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دو بار یہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۝﴾ (آل عمران:۹' الرعد:۳۱) ''یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا!'' اور دو ہی بار یہ فرمایا: ﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ (البقرۃ:۸۰) ''پس اللہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا اپنے وعدے کے!'' اور ﴿وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ﴾ (الحج:۴۷)۔ گویا اللہ تعالیٰ اور قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کو قرآن مجید کے متن کی سالمیت اور محفوظیت کے معاملے میں ہرگز کبھی کسی قسم کا شک و شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

جمع قرآن کے دو مراحل

اس آیۂ مبارکہ میں جمع قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی جس ذمہ داری کا ذکر ہے اس کا اوّلین مصداق تو جمیع مفسرین و محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع فرما دیا تھا۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ضمن میں کسی کو کوئی اختلاف یا اشتباہ ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ جمع قرآن کے دوسرے مرحلے کے ضمن میں لاعلمی کے باعث بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں مختلف النوع شبہات پائے جاتے ہیں۔

جمع قرآن کا یہ مرحلۂ ثانی قرآن مجید کو ایک کتابی شکل میں جمع کرنے کا تھا جو بالاجماع نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد طے پایا' اس لیے کہ اس پر اتفاق ہے کہ ''مَابَیْنَ الدُّفَّتَیْنِ'' (جلد کے دو گتوں کے درمیان) قرآن کا ایک کتاب کی صورت میں جمع ہو جانا آنحضور ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک قرآن جس طرح نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع تھا اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد کے بھی صرف سینوں میں محفوظ تھا۔

اس مرحلۂ ثانی کے بارے میں ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات تو وہ ہے جو خلیفہ ثالث ذُوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ قافیہ کی مناسبت سے ''جَامِعُ آیَاتِ الْقُرْآن'' کے الفاظ چسپاں کر دینے کے باعث بہت بڑے حلقے میں پھیل گئی ہے' جس سے ذہنوں میں خواہ مخواہ یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید قرآن کتابی صورت میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کے کم از کم پندرہ بیس سال بعد جمع ہوا' اور یہ وسوسہ منطقی طور پر بہت سے شکوک وشبہات کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے' جبکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ مصحف کی صورت میں قرآن مجید کے جمع ہو جانے کا مرحلہ تو دورِ خلافتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی میں' گویا نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کے اندر اندر' طے پا گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو فی الواقع اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا تھا۔ گویا اگر قافیہ کی رعایت ہی ملحوظ رہے تب بھی اُن کی شان میں ''جَامِعُ الْاُمَّةِ عَلَی الْقُرْآن'' کے الفاظ زیادہ موزوں بھی ہیں اور مطابقِ واقعہ بھی!

سورتوں اور آیات کی ترتیب

جمع قرآن کے ضمن میں دوسرا بڑا وسوسہ اور مغالطہ آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب سے متعلق ہے' جس کے ازالے کے لیے اوّلاً تو لفظ ''جَمْعَهٗ'' ہی میں واضح اشارہ موجود ہے' اس لیے کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن کا جمع ہونا بغیر ترتیب کے ممکن نہیں ہے۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت وصراحت دوسرے لفظ یعنی ''قُرْاٰنَهٗ'' کے ذریعے کر دی گئی' جس کا ترجمہ ''اس کا پڑھنا'' بھی کیا جا سکتا ہے اور ''اس کا پڑھوانا'' بھی۔

لیکن اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ ''قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر و توضیح کرتا ہے'' تو سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۝۶﴾ ''ہم عنقریب آپ کو پڑھوا دیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں'' کے مطابق یہاں بھی زیادہ موزوں ترجمہ ''پڑھوانا'' ہی ہوگا۔ چنانچہ اگلی آیت مبارکہ: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸﴾ ''تو جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپ اسی پڑھوانے کی پیروی کریں'' مزید دلالت کر رہی ہے کہ یہاں زیادہ زور اور تاکید ترتیبِ قرآنی کے بارے میں ہے' اس لیے کہ اوّلاً پڑھوانا لامحالہ کسی ترتیب ہی کے ساتھ ممکن ہے اور ثانیاً نبی اکرم ﷺ کو اسی ترتیب کی پابندی اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

''قَرَاْنٰهُ'' میں جو ضمیر فاعلی جمع متکلم کے صیغہ میں موجود ہے اس کے بارے میں اگرچہ دو احتمالات موجود ہیں' یعنی ایک یہ کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور دوسرے یہ کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہوں' لیکن از روئے آیاتِ قرآنی: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰) ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اصلاً اللہ ہی کی اطاعت کی'' اور ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ﴾ (الفتح: ۱۰) ''یقیناً جو لوگ (اے نبیؐ!) آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔ ان دونوں احتمالات سے معنی اور مراد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گویا فی الحقیقت تو اس پڑھوانے کا فاعل حقیقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود تھا' لیکن مجازاً یا بالفعل یہ پڑھوانا حضرت جبرائیلؑ کا فعل تھا۔ چنانچہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ ہر رمضان المبارک میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دَور فرمایا کرتے تھے اور اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری رمضان المبارک میں آپؐ نے پورے قرآن کا دو مرتبہ دَور مکمل کیا۔ اور ظاہر ہے کہ نہ آپؐ کا یہ دَورۂ قرآن کسی ترتیب کے بغیر ممکن تھا' نہ ہی آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو حضرات پورے قرآن کے حافظ تھے وہ بغیر کسی ترتیب کے حفظ کر سکتے تھے۔

غرضیکہ عقلاً اور نقلاً ہر اعتبار سے یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک

خاص ترتیب سے نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضور ﷺ نے اُمت کو قرآن سکھایا اور یاد کرایا' اور امانتِ خداوندی کو کامل دیانت کے ساتھ اُمت کے حوالے کر دیا' جیسے کہ آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ :كِتَابُ اللّٰهِ)) (۱)

''میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے' یعنی اللہ کی کتاب۔''

غلط فہمی کا سبب

اس ضمن میں مغالطہ کا سبب یہ ظاہر و باہر اور متفق علیہ حقیقت ہے کہ قرآن کی ترتیب نزولی مصحف کی ترتیب سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن اگر ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کے فرق کی حکمت کو سمجھ لیا جائے تو شیطان کو کسی وسوسہ اندازی کا موقع نہیں مل سکتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا وہ کلامِ قدیم ہے جو ازل سے ''لوحِ محفوظ'' (البروج:۲۲) یا ''اُمّ الکتاب'' (الزخرف:۴) یا ''کتابِ مکنون'' (الواقعہ:۷۸) میں درج ہے' اور یہ وہ ابدی ہدایت نامہ ہے جو تا قیامِ قیامت تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کفایت کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

''نوعِ اِنساں را پیامِ آخریں
حامل اُو رحمۃٌ لِّلعالمیں!''

اس کا نزول نبی اکرم ﷺ پر ایک خاص زمانے میں اور مخصوص حالات کے تناظر میں ہوا۔ اور یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ اس کی آیاتِ بینات ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر اتنے معجزانہ طور پر چسپاں ہوتی چلی گئیں جیسا کہ وہ خاص اُن ہی حالات کے لیے نازل ہوئی ہوں' اور اس طرح آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی دعوت و تحریک کے جاں

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔

گسل حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے ضمن میں بروقت ہدایت و رہنمائی ملتی چلی گئی، جس سے آپؐ کے قلبِ مبارک کو بھی جماؤ اور ٹھہراؤ اور استقامت حاصل ہوتی چلی گئی اور آپؐ کے صحابہؓ کے دلوں کو بھی سہارا ملتا رہا اور ان کی ڈھارس بندھی رہی۔ چنانچہ یہی بات ہے جو سورۃ الفرقان کی آیت ۳۲ میں بیان ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾﴾

''اور کافروں نے کہا کہ ان (محمد ﷺ) پر قرآن ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یہ اس لیے کیا کہ اس کے ذریعے (اے نبیؐ!) آپ کے دل کو جماؤ عطا فرما دیں، اور ہم نے اسے پڑھوایا تھوڑا تھوڑا کر کے!''

گویا ترتیبِ نزولی کی اصل حکمت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے اور آپؐ کی جدوجہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے ان کی مناسبت سے آیاتِ قرآنیہ نازل ہوتی چلی جائیں تاکہ آپؐ کو بروقت رہنمائی ملے، اور ہر مرحلے پر جو اعتراضات آپؐ پر کیے جائیں، یا جو سوالات و اشکالات آپؐ کے سامنے پیش کیے جائیں ان سب کا حل اور جواب ساتھ کے ساتھ ملتا چلا جائے، جبکہ ترتیبِ مصحف وقتی حالات کے تابع نہیں ہے، بلکہ لوحِ محفوظ، یا کتابِ مکنون، یا اُمّ الکتاب کے عین مطابق ہے اور اس کا اصل ہدف ابدی ہدایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات اور سورتوں کی اس ازلی اور ابدی ترتیب میں غور و فکر کرنے والوں کو عظیم حکمتوں اور علوم و معارف کے نہ ختم ہونے والے خزانوں کا سراغ ملتا ہے اور اس سے علم و حکمت قرآنی کے نئے نئے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ ترتیب ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع فرمایا اور اسی کی پیروی اور پابندی کا آپؐ کے متبعین کو حکم دیا، اور یہی ترتیب اب ہمیشہ کے لیے دین میں حجت ہے!!

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں اُس وقت مرتب اور جمع کیا جب جنگِ یمامہ میں بہت سے حفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے اور اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اس طرح نوعِ انسانی قرآن سے محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ آں جنابؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے جملہ کاتبین وحی کو جمع کر کے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اُن کا ناظم اور سربراہ بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیں۔ چنانچہ پورا قرآن کریم جو حفاظِ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس کے بعض اجزاء اور مختلف سورتیں بعض صحابہؓ کے پاس تحریری شکل میں بھی موجود تھیں' ان سب کی مدد سے قرآن مجید کو ''بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ'' یعنی جلد کے دو گتوں کے درمیان کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا۔ البتہ اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے۔ جیسے اردو زبان کے بھی مختلف لہجے ہیں' لکھنوی لہجہ اور ہے اور دہلی کا لہجہ اور' اسی طرح حیدرآبادی لہجہ جدا ہے اور بہاری لہجہ جدا' اور ابتداءً لوگوں کی سہولت کے لیے انہیں قرآن مجید کو اپنے اپنے لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی' لہٰذا مختلف لہجوں کا اثر قرآن کریم کی کتابت وقراءت میں بھی آ رہا تھا۔ چنانچہ اُمت پر یہ احسانِ عظیم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا ہے کہ آپؓ نے اپنے دَورِ خلافت میں اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا۔ گویا آنجنابؓ قرآن کریم کو جمع کرنے والے نہیں ہیں' بلکہ اُمت کو قرآن کی ایک کتابت پر جمع کرنے والے ہیں۔

الغرض سورۃ القیامۃ کی یہ دو آیات ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾﴾ ''(اے نبیؐ!) یقیناً ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھوانا بھی' تو جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپؐ اس کو اسی ترتیب سے پڑھیے''۔ حفاظت متنِ قرآن اور جمع وترتیبِ قرآن کے ضمن میں قرآن کا ذروۂ سنام ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۹ میں فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ ''پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کی تبیین (یعنی توضیح وتشریح)۔ یہ بات بھی نہایت اہم ہے' اور جس طرح جمع قرآن کے دو مرحلے تھے اسی طرح اس کے بھی دو حصے ہیں' جن کو اچھی طرح سمجھ لینا

چاہیے۔ چنانچہ ایک حصہ تو یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں نازل شدہ احکام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہو جاتی تھیں۔ ایسی آیات بعض اوقات تو اُسی کے حکم کے ساتھ متصلاً درج کر دی گئی ہیں' بعض اوقات انہیں کسی قدر فصل کے ساتھ درج کیا گیا ہے' اور بعض اوقات سورۃ کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کے بارے میں تفصیلی احکام پر مشتمل آیت سورۃ البقرۃ کے اسی تیئیسویں (۲۳) رکوع کے آخر میں شامل کر دی گئی جس میں ابتدائی حکم درج ہے' جبکہ دوسری اور تیسری صورتوں کی نمایاں مثالیں سورۃ النساء میں موجود ہیں۔ ایسی توضیحی آیات کے ساتھ آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ﴾ ''اسی طرح اللہ اپنی آیات کی تبیین (اور وضاحت) فرما دیتا ہے۔''

الغرض ایک تو تبیینِ قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح و توضیح کی صورت یہ ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے ذریعے ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک دوسرا نظام بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کا یہ فرضِ منصبی قرار دیا گیا کہ آپؐ قرآن مجید کی تشریح و توضیح اور تبیین فرمائیں۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۴۴ میں فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر الذکر (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لیے وضاحت کریں اُس چیز کی جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے''۔ گویا قرآن مجید کی توضیح و تبیین کی ایک صورت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت خصوصی یا وحیٔ خفی پر مبنی سنتِ رسولؐ کے ذریعے سامنے آئی۔ اس سلسلے میں کچھ کج فہم اور گم کردہ راہ لوگوں کا یہ اِشکال بالکل بے بنیاد ہے کہ اگر قرآن پر سنتِ رسولؐ کا اضافہ کیا جائے تو یہ قرآن کی توہین ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مکمل نہیں ہے اور وہ اپنی وضاحت کے لیے سنت کا محتاج ہے۔ معاذ اللہ' کوئی صاحب ایمان قرآن کے متعلق ہرگز یہ تصور اور خیال نہیں رکھتا کہ قرآن سنت کا محتاج ہے' البتہ تمام مسلمانوں کا اجماعی و متفق علیہ موقف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کی رہنمائی

پر عمل پیرا ہونے کے لیے سنت رسولؐ کے محتاج ہیں۔ گویا یہ احتیاج ہماری ہے کہ ہم فہم قرآن اور عمل بالقرآن کے لیے نبی اکرم ﷺ کے اقوال اور افعالِ مبارکہ کو اپنے سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید پر کس طرح عمل کر کے دکھایا اور تعلیماتِ قرآن کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں کس طرح بالفعل نافذ کیا اور اس طرح اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس لیے کہ اسی کے حوالے سے ہم قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں گے اور اس پر عمل بھی کر سکیں گے' اور سنت کی یہ تبیین بھی حکماً ہدایتِ قرآن ہی کا حصہ ہوگی' اس لیے بھی کہ اس تبیینِ قرآن کا حکم اللہ ہی نے آپؐ کو دیا ہے — اور اس لیے بھی کہ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعدد کاموں کو صراحتاً اپنی طرف منسوب فرمایا ہے' جس کی ایک نمایاں مثال سورۃ الانفال میں وارد ہوئی ہے کہ غزوۂ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھر کر کفار کی طرف پھینکی تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ (آیت ۱۷) ''اور (اے نبیؐ!) جب آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو آپؐ نے نہیں پھینکی تھیں' بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں''۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں تعبیر کیا ہے: ؎

گفتہ اُو گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

الغرض' معانی و مطالبِ قرآن کی وضاحت کا ذمہ بھی از روئے آیۂ مبارکہ اللہ نے خود لیا تھا' جو کچھ تو خود قرآن حکیم کی توضیحی آیات کے ذریعے پورا ہوا اور اکثر و بیشتر سنت رسول ﷺ کے ذریعے پورا ہوا۔

بارك اللّٰه لی ولكم فی القرآن العظيم ونفعنی وایاكم بالآيات والذكر الحكيمoo